Regd. L. No.7243 Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1973

اس پرچے میں

قرآن سوشلسٹوں کے نرغے میں

محترم حنیف رامے صاحب کی بجٹ تقریر

آئندہ پرچہ میں

کیا ہم آزاد ہیں؟

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک

پاکستان

سالانہ ——— دس روپے

غیر ممالک

سالانہ ——— ایک پونڈ

ٹیلیفون نمبر

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

بنام ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ

ایک روپیہ

جلد ۲۶ | اگست ۱۹۷۳ء | نمبر ۸

فہرست

۱۔ لمعات ——— ۲

۲۔ شذرات ——— ۴

۳۔ قرآن۔ سوشلسٹوں کے نرغے میں ——— ۷

۴۔ مفسدین کا انجام ——— (محترم پرویز صاحب) ——— ۲۵

۵۔ نمائندہ جاپان کا پرویز صاحب سے انٹرویو ——— ۴۳

۶۔ حقائق و عبر۔ (علماء کا نقاب کیوں باقی نہیں رہا)۔ (کیا یہ طریق اسلامی ہے) ——— ۵۰

۷۔ انڈیا کے ساتھ ہمارے تعلقات ——— ۵۷

ایڈیٹر محمد خلیل: ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵ بی گلبرگ۔ لاہور ۱۱۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس۔ ایبک روڈ لاہور

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ

لمعات

آپ کو معلوم ہے کہ ہمیں اندھیرے میں ڈر کیوں لگتا ہے؟ اس لئے کہ اندھیرے میں کوئی شے اپنی اصلی حالت میں نظر نہیں آتی۔ اور اس لاعلمی کی وجہ سے ہمارا واہمہ ہمیں رسّی کو بھی سانپ بنا کر دکھاتا ہے۔ روشنی آتی ہے تو رسّی، رسّی اور سانپ، سانپ نظر آجاتا ہے۔ رسّی کو ہم یونہی اٹھا کر پھینک دیتے ہیں اور سانپ سے بچنے کی تدبیر کرتے ہیں۔ واہمہ کا پیدا کردہ ڈر دونوں صورتوں میں دور ہو جاتا ہے۔

جس تاریکی کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اس کا تعلق ہماری ماتھے کی (طبیعی) آنکھوں سے ہوتا ہے۔ لیکن انسانی دنیا میں ایک اور تاریکی بھی ہوتی ہے جو طبیعی تاریکی سے کہیں زیادہ دبیز اور تہ در تہ ہوتی ہے۔ قرآنی استعارہ میں،

> جیسے کسی تلاطم انگیز سمندر کی گہرائیوں میں انتہائی تاریکی ہو۔ اس تاریکی کو اور تاریکیاں، موج در موج ظلمات کے گہرے پردے بن کر ڈھانپ رہی ہوں۔ ان تاریک موجوں کے اوپر چاروں طرف، کالی گھٹائیں چھا رہی ہوں۔ مختصراً یہ کہ تاریکیوں پر تاریکیوں کی تہیں چڑھ رہی ہوں اور حالت یہ ہو کہ اگر کوئی اپنا ہاتھ باہر نکالے تو اسے وہ ہاتھ بھی نظر نہ آئے۔ (۲۴/۴۰)

یہ تاریکی ہوتی ہے جہالت کی جسے علم کی روشنی دور کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم علم کو انسانیت کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ حیوانات اپنی زندگی جبلی تقاضوں (INSTINCTS) کے تابع بسر کرتے ہیں۔ انسان اپنا علم کی روشنی میں کرتا ہے۔ اگر اس کے سامنے علم کی روشنی نہ رہے تو پھر اس کے عمل و ارادے کی محرک حیوانی جبلتیں ہی رہ جاتی ہیں جنہیں قرآن 'اھواء' کہہ کر پکارتا ہے۔ یہ حیوانی زندگی ہوتی ہے۔ بلکہ اس سے بھی بدتر اور شرانگیز۔ ایسے لوگوں کو قرآن کریم ظالم کہہ کر پکارتا ہے جب کہتا ہے کہ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَھْوَآءَھُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ۔ (۳۰/۲۹) یہ ظالم، علم کے بغیر اپنے جذبات کا اتباع کرتے ہیں۔ یہ لوگ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ وَ اِنَّ کَثِیْرًا لَّیُضِلُّوْنَ بِاَھْوَآئِھِمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ (۶/۱۱۹) یہ لوگ علم کے بغیر اپنے جذبات کی بنا پر دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ اسی لئے اس بات کی تاکید کر دی گئی کہ لَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (۴۵/۱۸) ان لوگوں کے جذبات کا اتباع مت کرو جو علم نہیں رکھتے۔ فقدانِ علم اور اتباعِ جذبات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اسے قرآن کریم "دلوں پر مہریں لگ جانے" سے تعبیر کرتا ہے۔ کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (۳۰/۵۹) اس طرح اللہ ان لوگوں کے دلوں پر مہریں لگا دیتا ہے جو علم نہیں رکھتے۔

ہم نے شروع میں کہا ہے کہ جب شبِ تاریک میں روشنی کے فقدان کی وجہ سے کوئی شے اپنی اصلی حالت میں نظر نہیں آتی تو واہمہ عجیب و غریب قسم کے خیالی خطرات پیدا کرتا رہتا ہے۔ عملی دنیا میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا جائے گا کہ جب انسان کے پاس کسی شے کا علم نہ ہو تو وہ ظن و قیاس سے کام لے گا لیکن علم کے مقابلہ میں ظن و قیاس کی کوئی حقیقت اور حیثیت ہی نہیں ہوتی۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ وَ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ۔ علم ان کے پاس ہے نہیں۔ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ۔ اس لئے یہ صرف ظن و قیاس کی وادیوں میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے وَ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا۔ (۵۳/۲۸) حقیقت کے مقابلہ میں ظن و قیاس کی کچھ حیثیت اور قیمت نہیں ہوتی۔ ان اور ان جیسی دیگر بے شمار تصریحات کے بعد قرآن کریم نے اس عظیم حقیقت کو ان چار لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا کہ

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (۳۹/۹)

ان سے پوچھو کہ وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے کیا یہ دونوں کبھی برابر ہو سکتے ہیں۔

(۵)

یوں تو علم انسان کی انفرادی زندگی میں بھی متاعِ بے بدل اور زندگی کی کامرانیوں کے لئے شرطِ لاینفک ہے۔ لیکن اجتماعی زندگی کے قیام و بقا کے لئے یہ اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی مملکت کے قیام کے ساتھ ہی افرادِ معاشرہ کو یہ تاکیدی ہدایت کر دی کہ

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا۔ (۱۷/۳۶)

جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ یاد رکھو، تمہارے سننے، دیکھنے اور سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں سے اس کی باز پرس ہو گی۔

اس اصولی ہدایت کے بعد ان سے متعین طور پر کہہ دیا کہ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًاۢ بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ (۴۹/۶)

اے جماعتِ مومنین! اگر کوئی شر پسند کوئی خبر پھیلائے تو اس پر یونہی اعتبار نہ کر لیا کرو۔ اس کی تحقیق کر لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم بے خبری سے کسی گروہ کو نقصان پہنچا دو اور پھر اس پر تمہیں نادم ہونا پڑے۔

اس زمانے میں ذرائع ابلاغ کی اس قدر فراوانی اور وسائل رسل و رسائل کی ایسی برق روی نہیں جیسی آج ہے۔ اس وقت اس کا ذریعہ صرف انسانی نقل و حرکت تھی۔ بایں ہمہ حکومت کی طرف سے اس سلسلہ میں ایسا انتظام تھا کہ صحیح معلومات ملک کے دور دراز گوشوں تک کمال سرعت سے پہنچ جاتی تھیں۔ صلوٰۃ کے اجتماعات اور کثیر التعداد خطبات اس مقصد کے حصول کے اولین ذرائع تھے۔ ان کے ذریعے افرادِ معاشرہ کو ملکی مصالح اور احوالِ مملکت سے زیادہ سے زیادہ حد تک باخبر رکھا جاتا تھا۔ ان امور کے متعلق لوگوں کو از خود دریافت کرنے کی بھی اس قدر اجازت تھی اور ان کی اس طرح

حوصلہ افزائی کی جاتی تھی کہ ہر شخص رموزِ مملکت کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر سکتا تھا۔ یہ اس لئے کہ نظامِ مملکت شورائی تھا۔ اور افرادِ معاشرہ اسی صورت میں صحیح مشورے دے سکتے تھے جب وہ مملکت سے متعلق صحیح حالات سے اچھی طرح باخبر ہوں۔ اس طریق کار کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ کسی مستقل فوج (STANDING ARMY) کے بغیر مملکت نہایت مستحکم تھی۔ رعایا کو اپنے راعی پر اعتماد کلی حاصل ہوتا تھا کہ نہ اس کی کوئی ذاتی بات ان سے پوشیدہ ہوتی تھی، نہ مملکت کی کوئی مصلحت۔ اور راعی کو رعایا پر کامل بھروسہ تھا کیونکہ وہ ان کے تمام حالات سے باخبر رہتا تھا اور کسی کے لئے کسی قسم کی شکایت کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ یہ تھا قرآن کے تجویز کردہ نظامِ مشاورت کا نتیجہ اور مملکت میں علم کے عام کرنے کا نہایت خوشگوار ماحصل۔

لیکن بعد میں جب ملوکیت آئی تو یہ نقشہ بالکل اُلٹ گیا۔ ملوکیت نے اپنے حفظ و بقا کا راز اس میں سمجھا کہ رعایا کو کم از کم "شریکِ حکم" کیا جائے اور انہیں رموزِ مملکت سے زیادہ سے زیادہ بے خبر رکھا جائے۔ اول تو کوشش کی جائے کہ کوئی رازِ درونِ خانہ' ایوانِ حکومت سے باہر نہ آنے پائے۔ اور اگر کسی خبر کا عام کرنا ضروری سمجھا جائے تو اُسے مفادِ خویش کے پیشِ نظر خاص رنگ دے کر باہر لایا جائے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا تھا کہ حاکم اور رعایا کے درمیان ایک بلند دیوار حائل ہو جاتی تھی۔ فرماں رواتک رعایا کے حالات پہنچنے کا ذریعہ صرف حکومت کے مقرر کردہ وقائع نگار رہ جاتے تھے اور رعایا کی شکایات قصرِ ملوکیت کے اندر پہنچانے کا ذریعہ حاجب و دربان۔ رعایا اور فرماں روا کے درمیان یہی بُعد اور فاصلے تھے جو باہمی عدم اعتماد کا موجب بنتے اور آخر الامر بغاوتوں پر منتج ہوتے تھے۔ حافظ نے جو کہا تھا کہ

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا! مخروش

تو اس سے اسی اندازِ ملوکیت اور اس کے نتائج کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔

مغرب کا نظامِ جمہوریت، ملوکیت کے خلاف صدائے احتجاج تھا۔ اس لئے اس میں ملوکیت کی دیگر بدعنوانیوں کے استیصال اور استقام و نقائص کی اصلاح کے لئے کہا یہ گیا کہ یہ عوام کی حکومت ہے جس میں نہ کوئی حاکم ہوتا ہے نہ محکوم۔ اس لئے اس میں رموزِ مملکت عوام سے پوشیدہ نہیں رکھے جاتے، بجز ان مستثنیات کے جن کا قبل از وقت عام کرنا مصالحِ مملکت کے خلاف ہو۔ جب وہ مصلحت باقی نہ رہے گی تو وہ بھی عوام کے سامنے آجائیں گے۔ نہ صرف رموزِ مملکت بلکہ حکومت کے مختلف اقدامات اور ان کی غرض و غایت اور حکمت و مصلحت سے بھی عوام کو باخبر رکھا جائے گا۔ اس سے عام باشندگانِ مملکت اور برسرِ اقتدار طبقہ میں باہمی اعتماد قائم رہے گا، اور حکومت کو رعایا کا تعاون حاصل۔ یہ اس نظام کی خصوصیت تھی، ورنہ اقتدار تو اس میں بھی عوام کے ہاتھ میں نہیں ارباب حکومت ہی کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ جن بیشتر اقوام کے ہاں یہ نظام ہموار طریق سے چل رہا ہے وہاں کیفیت بالعموم ایسی ہی ہے۔ ہمارے ہاں قیامِ مملکت کے روزِ اول سے جمہوری نظام رائج ہے۔ لیکن صورت یہ ہے کہ قوم کو کبھی رموزِ مملکت سے آگاہ رکھنے کی ضرورت سمجھی گئی ہے، نہ حقیقی احوال و کوائف سے باخبر رکھنے کی حاجت۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ صحیح معلومات نہ ہونے کی

وجہ سے قوم قیاس آرائیوں سے کام لیتی ہے اور افواہیں پھیلانے والے اس کا جی بھر کر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ آئے دن بیانات شائع ہوتے رہتے ہیں کہ ملک میں ایسے تخریبی عناصر موجود ہیں جن کی بیرونی طاقتوں سے سازباز ہے اور وہ ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے پر تُلے بیٹھے ہیں۔ لیکن آج تک نہ ان عناصر کی کبھی نشاندہی کی گئی ہے (کہ قوم ان سے محتاط ہو جائے) اور نہ ہی یہ بتایا گیا کہ اس سازش کی روک تھام کے لئے کیا اقدامات کئے گئے ہیں۔ کبھی کہیں سے ناجائز اسلحہ کے ذخائر برآمد ہوتے ہیں جن کی ملک میں نمائش بھی کی جاتی ہے لیکن اس کے بعد قوم کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا مآل کیا ہوا۔ کوئی دعوے کرتا ہے کہ ہمیں معلوم ہے کہ ملک میں ناجائز اسلحہ کہاں کہاں چھپا ہے۔ لیکن نہ اس اسلحہ کی نشاندہی ہوتی ہے نہ برآمدگی۔ بعض لوگوں کی گرفتاریاں عمل میں آتی ہیں تو نہایت سنگین اور خطرناک جرائم کے الزامات کے ساتھ۔ اس کے بعد یکایک ان کی رہائی کے احکام صادر ہو جاتے ہیں اور قوم کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ پہلے گرفتاری کیوں ہوئی تھی اور اب رہائی کیوں۔ اور متعلقہ اشخاص معتبر کے معتبر بنے اپنے اپنے پروگراموں میں مصروف رہتے ہیں۔ اشیائے صرف کی گرانی کا یہ عالم ہے کہ ان کی قیمتیں راکٹ کی رفتار سے آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ غریب اور متوسط حال طبقہ پس رہا ہے اور قیمتوں کا کم کرنا تو ایک طرف، کوئی اتنا بتانے والا بھی نہیں کہ اس گرانی کی وجہ کیا ہے۔ گرانی کے ساتھ بعض اشیاء یکایک بازار سے غائب ہو جاتی ہیں۔ صارفین چیختے ہیں، چلاتے ہیں لیکن قوم کو کوئی نہیں بتاتا کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ اور تو اور، بنگلہ دیش جیسا اہم واقعہ، گزشتہ ڈیڑھ برس سے منظور نامنظور کا جھولا جھول رہا ہے۔ لیکن اس کے متعلق تمام گفتگو جذباتی ہوتی ہے۔ دلائل و براہین کی رُو سے، اور اعداد و شمار کی روشنی میں قوم کو کوئی نہیں بتاتا کہ ایسا کرنے میں کیا فائدہ ہے اور نہ کرنے میں کیا نقصان۔ ہماری قوم پہلے ہی کچھ کم جذباتی نہ تھی کہ حقائق سے بے خبر رہتے اور اہم ترین معاملات سے متعلق بھی محض جذباتی بحثیں سننے کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے جذبات قابو سے باہر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمارا سخت ترین اور نہایت شاطر ہمسایہ دشمن اس صورتِ حال سے خوب فائدہ اٹھا رہا ہے۔ جو لوگ آل انڈیا ریڈیو سنتے ہیں، انہیں معلوم ہے کہ اس کا پراپیگنڈہ کس قدر گہرا اور مؤثر ہوتا ہے۔ جنگی قیدیوں اور بنگلہ دیش کے مسائل سے متعلق اس نے گزشتہ دو تین ماہ سے جو مہم بالخصوص شروع کر رکھی ہے، اس کے نتائج بڑے خطرناک ہیں۔ وہ اپنے مؤقف کو ایسے ٹھنڈے، دھیمے، سنجیدہ اور باوقار انداز سے مسلسل پیش کئے جا رہا ہے جس سے عوام تو ایک طرف، خواص تک بھی غیر شعوری طور پر یہ تاثر لینے لگ جاتے ہیں کہ وہ واقعی حق پر ہے۔ حالانکہ جو کچھ وہ کہتا ہے اس کی بنیاد کذب و افترا پر ہوتی ہے۔ ہماری طرف سے نہ یہ دلائل و براہین اس کی تردید ہوتی ہے نہ اپنے مؤقف کو علیٰ وجہ البصیرت پیش کیا جاتا ہے۔ ہمارے ذرائع ابلاغ بدستور لُڈی، ستی، دھمال، ڈھولک کی افیون گھولنے میں مصروف رہتے ہیں اور اگر کبھی اونگھتے اونگھتے نیم بانہ سے سیاسی مسائل کے متعلق بات چیت ہوتی ہے تو ایسی خمار آلودہ کہ سننے والے بھی جمائیاں لینے لگ جاتے ہیں۔ ہم صدرِ مملکت کی خدمت میں باادب لیکن پُر زور گزارش کریں گے کہ وہ اس طرف جلد از جلد توجہ دیں اور قوم کو مصالحِ ملکی اور حقائقِ ملی سے علیٰ وجہ البصیرت باخبر رکھنے کے لئے مؤثر اقدامات عمل میں لائیں۔ اسی سے ایسی فضا پیدا ہو سکے گی جس سے ملک اندرونی خطرات سے بھی محفوظ رہ سکے گا اور قوم بیرونی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے بھی قابل ہو سکے گی۔ ہمیں قرآنِ عظیم کی اس تنبیہ کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ جاننے والے اور نہ جاننے والے کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ باقی رہے وہ راز جن کا افشا قرینِ مصلحت نہ ہو تو ان کے متعلق بھی اس امر کی وضاحت کر دی جائے۔

(---)

لمعات

۱۔ ایک مستحسن اقدام

حال ہی میں حکومت برطانیہ نے صدر بھٹو کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تو انہوں نے اس دعوت کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ چونکہ تمہارے ہاں غیر ملکیوں کے لئے ایک ایسا قانون بنایا جا رہا ہے جس کا اطلاق کسی سابقہ تاریخ سے ہوگا اور یہ قانون سازی کی اچھی مثال نہیں۔ اس لئے میں تمہارے ہاں نہیں آنا چاہتا۔ یہ صدر بھٹو کا بڑا معقول اعتراض تھا۔ حکومت برطانیہ نے اعتراض کی معقولیت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے قانون میں ترمیم کر دی اور اس کے بعد صدر بھٹو نے ان کی دعوت منظور کر لی۔ (پاکستان ٹائمز ۱۷)

صدر بھٹو کا یہ اقدام بڑا مستحسن تھا جسے عام طور پر سراہا گیا۔ لیکن آئین پاکستان میں ایک شق رکھی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ دستورِ پاکستان کو منسوخ یا معطل کرنا جرم ہوگا جس کی سزا موت ہو سکتی ہے۔ اور اس قانون کا اطلاق ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء سے ہوگا۔ طلوع اسلام بابت فروری ۱۹۷۳ء میں مسودہ قانون پر بحث کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا کہ یہ چیز عام اصول عدل کے بھی خلاف ہے اور قرآنی حکم کے بھی خلاف۔ کسی تعزیری قانون کا اطلاق کسی سابقہ تاریخ سے نہیں کیا جانا چاہیئے۔ اس پر کسی نے توجہ نہ دی۔

(۔)

۲۔ "سنت رسول اللہ"

نیپ کے جنرل سیکرٹری اجمل خٹک صاحب چوری چھپے سرحد پار کر کے کابل چلے گئے ہوئے ہیں اور وہاں پختونوں کے لئے جداگانہ مملکت کی مہم میں معروف ہیں۔ سرحد نیپ کے سابق صدر ارباب سکندر خان نے حال ہی میں ایک پریس کانفرنس میں کہا ہے کہ اجمل خٹک کا یہاں سے چلے جانا "ہجرت" ہے۔ جسے اسلام میں سنت کا درجہ حاصل ہے۔ (پاکستان ٹائمز ۱۵)

بجا فرمایا لیکن ملت فروشی میں ملک کے اندر رہتے ہوئے ملک سے غداری "فریضۂ خداوندی" اور بیرون ملک جا کر اپنے ملک کے خلاف سازش (معاذ اللہ) "سنت رسول"!

افغانستان کے حالیہ انقلاب میں کہیں اسی "سنت" کی برکات تو شامل نہیں کیونکہ وہاں سے پہلی آواز "پختونستان" کے حق میں اٹھی ہے۔

(۔)

قرآن سوشلسٹوں کے نرغے میں

محترم حنیف رامے صاحب کی بجٹ تقریر

حکومتِ پنجاب کے وزیر مالیات محترم محمد حنیف رامے نے اگلے دنوں اسمبلی میں ۱۹۷۳-۷۴ء کا صوبائی بجٹ پیش کر دیا۔ بجٹ، آمد و خرچ کے اس تخمینہ پر مشتمل ہوتا ہے جسے حکومتیں اپنا کاروبار چلانے کے لئے مرتب کرتی ہیں۔ اس بنا پر ہم نے کبھی انہیں کسی گہری توجہ کا سزاوار نہیں سمجھا۔ لیکن اگر ان میں کوئی ایسی بات ہو جو قرآنی اصول و اقدار سے ٹکراتی ہو تو اس کا جائزہ لینا ضروری ہو جاتا ہے کہ یہ ہماری زندگی کا مشن ہے۔ ان سطور کی تصوید کا محرک بھی یہی جذبہ ہے۔ محترم حنیف صاحب نے بجٹ پیش کرتے ہوئے ایک طویل تقریر فرمائی۔ اس تقریر کا وہ حصہ جو ہمارے نزدیک توجہ طلب ہے۔ درج ذیل ہے انہوں نے (روزنامہ امروز بابتہ ۱۰ جون میں شائع شدہ متن تقریر کے مطابق) فرمایا:

"جناب والا! میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ بجٹ میرے لئے محض حساب کتاب کا معاملہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بجٹ کی صورت میں حکومت کی اقتصادی پالیسی کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اس کی وساطت سے واضح کیا جاتا ہے کہ اقتصادی شعبے میں ہمارے مقاصد کیا ہیں اور ہم ان مقاصد کے حصول میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ جہاں تک مقاصد کا تعلق ہے۔ ان کی جانب آج کی گفتگو کے دوران متعدد اشارے ہو چکے ہیں لیکن اب میں انہیں ایک جامع تعریف میں ڈھالنے کی جرأت کرتا ہوں۔ ہمارے مقاصد کی منزل جاگیرداری، سرمایہ داری اور سامراجی بندھنوں کو توڑ کر پیداواری قوتوں کو آزاد کرنا اور انہیں اجتماعیت کی بنیادوں پر از سر نو ترتیب دینا ہے۔ یوں کہہ لیجئے کہ ہم سوشلسٹ معیشت برپا کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ کوئی معمولی کام نہیں۔ ہم سیاسی طور پر آزاد ہونے کے باوجود اقتصادی طور پر ابھی نوآبادیاتی شکنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ہمارا علاج سوشلزم کے سوا کچھ نہیں لیکن ہماری کیفیت ایسی ہے کہ شیکسپیئر کے الفاظ میں اشیاء اور رویے تو ابھی پوری طرح سوشلزم کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئیں۔ البتہ ایک سیاسی جماعت برسر اقتدار آگئی ہے جو سوشلزم لانے کی پابند ہے، اب ایک راستہ ہے کہ ہم قدم قدم چلیں لیکن ہمارا ہر قدم سوشلزم کی منزل کی جانب بڑھ رہا ہو، ہماری حکومت نے یہی روش اختیار کی ہے، صدر بھٹو کی تمام تر اصلاحات اور اقتصادی پالیسیوں کا یہی مقصد ہے۔

مگر جناب عالا! اس راہ میں بڑے کٹھن موڑ آتے ہیں۔ سب سے خطرناک موڑ وہ ہے جہاں دائیں بازو کے لوگ اس لئے برہم ہوتے ہیں کہ آپ سوشلزم لا رہے ہیں اور بائیں بازو کے لوگ اس لئے کہ آپ سوشلزم لانے میں دیر کر رہے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سوشلزم اور جمہوریت کے باہمی تعلق کو سمجھنا انتہائی ضروری ہو جاتا ہے۔ اجازت دیجئے کہ میں اس مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گزرنے والے ایک انقلابی کے اذکار کی جانب آپ کی توجہ مبذول کراؤں۔ ماؤزے تنگ نے ۱۹۳۹ء

میں چینی انقلاب اور اپنی پارٹی کی منزل متعین کرتے ہوئے کہا تھا:

> چین کی انقلابی تحریک دو مرحلوں پر مشتمل ہے۔ یعنی جمہوری انقلاب اور سوشلسٹ انقلاب۔ یہ کیفیت کے اعتبار سے دو مختلف انقلابی عمل ہیں اور دوسرا عمل صرف اسی وقت مکمل ہو سکتا ہے جب پہلا عمل مکمل ہو چکا ہو۔ جمہوری انقلاب سوشلسٹ انقلاب کے لئے لازمی تیاری کی حیثیت رکھتا ہے اور سوشلسٹ انقلاب جمہوری انقلاب کا ناگزیر نتیجہ ہوتا ہے۔

اگر کوئی انصاف کی نگاہ سے دیکھے تو آج ہم بھی سوشلزم لانے میں دیر نہیں کر رہے بلکہ جمہوری انقلاب کو مستحکم کر کے سوشلسٹ انقلاب کی جڑیں مضبوط کر رہے ہیں۔ چاروں صوبوں کے عوامی نمائندوں کی متفقہ رائے سے منظور ہونے والا دستور اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ ہمیں اپنے راستے کی خبر اور منزل کا شعور ہے۔ اس موقع پر میں اپنے سوشلسٹ دوستوں سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جمہوری انقلاب ہماری منزل نہیں راستہ ہے۔ ہماری منزل سوشلسٹ انقلاب ہی ہے البتہ اس منزل پر پہنچنے کے لئے ہم جمہوری انقلاب ہی کو صراطِ مستقیم گردانتے ہیں۔

جہاں تک ان صاحبوں کا تعلق ہے جو سوشلزم کے نام سے بدکتے ہیں۔ ان کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ ترقی پذیر ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے مظلوم و محکوم عوام کی تحریکاتِ آزادی کو نظر انداز کریں اور نہ ہی روحِ عصر کو پہچاننے سے گریز کریں۔ پھر سوشلزم کوئی بدعت نہیں یہ وہی نظامِ معیشت ہے جو اسلام کے اوّلین دور میں جلوہ گر ہوا۔ اسے محض اس لئے رد نہیں کیا جا سکتا کہ جب مسلمانوں نے مساوات کو ترک کر کے ملوکیت اختیار کر لی تو اس نظریے نے غیر مسلموں کے ہاں پناہ لے لی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نظریے کو قبول کر کے ہم اسلام سے منحرف نہیں ہوتے بلکہ اس کی اصل پاکیزگی کی جانب لوٹ آتے ہیں۔ یاد رکھنے کی بات یہی ہے کہ آج افلاس اور بے روزگاری نے ہمیں جس بری طرح گھیر رکھا ہے اس کا کوئی شافی علاج چاہیئے اور یہ علاج جلد از جلد چاہیئے۔ میں اس مسئلے پر آپ کا تھوڑا وقت لینا چاہتا ہوں۔

جنابِ والا! اگر ہم روایتی انداز سے ترقی کرنے کا خواب دیکھیں گے تو لازم ہے کہ سرمایہ دار طاقتوں کے دستِ نگر رہیں گے۔ ٹینک ہو یا ٹریکٹر، گندم ہو یا گولی باہر سے منگوانی پڑتی ہے۔ کمپیوٹر سے لے کر سڑک کوٹنے کے انجن تک تقریباً ہر مشین باہر سے لائی جا رہی ہے۔ مالی اور فوجی امداد ہمارا مقدر بنی ہوئی ہے۔ یہ صورتِ حال صرف اس لئے ہے کہ ہماری اقتصادی منصوبہ بندی کا تمام تر انحصار سرمائے پر ہے۔ اور یہی نکتہ سرمایہ دارانہ نظام کی اصل ہے اس اصل کو ایک ہی صورت میں بدلا اور اپنے حق میں بدلا جا سکتا ہے کہ ہماری منصوبہ بندی محنت کی بنیاد پر ہو۔ اور اسی کا نام سوشلزم ہے۔ سوشلزم میں محنت ہی پیدائشِ رزق اور تقسیمِ رزق کی اساس ہوتی ہے۔ ہم نے اپنے مستقل دستور کے آرٹیکل نمبر ۳ میں اس اساس کو ان الفاظ میں جگہ دی ہے کہ "ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرے اور ہر شخص اپنے کام کے مطابق اجر پائے۔" اب ہمیں اس اساس کو عملی قالب عطا کرنے ہیں اور یہ اہم کام جلد از جلد انجام دینا ہے اس لئے کہ اگر ہم نے دیر کی تو ہو سکتا ہے۔ کہ افلاس اور بے روزگاری کے عفریت سے تنگ آئے ہوئے لوگ بے چین ہو جائیں اور حالات قابو سے باہر نکل جائیں یہ بڑا ہی نازک مقام ہے جہاں ہم آج کھڑے ہیں۔ ہمیں جلد از جلد اپنی تمام تر آبادی کو محنت کی راہ پر ڈالنا ہے اور ان کی کدالوں اور کلہاڑیوں کو، ان کے بیلوں اور ٹریکٹروں کو ایک ساتھ حرکت میں لا کر پسماندگی کے جھاڑ جھنکار کو صاف کرنا ہے لیکن ساتھ ہی حکومت کو بھی کچھ نئی ذمہ داریاں قبول کرنا ہوں گی بیشک آج کے حالات میں نجی شعبہ کو کام کرنے کا موقع دینا ہو گا۔ لیکن سرکاری شعبہ کو مضبوط سے مضبوط تر کرنا بھی اشد ضروری ہے۔

سوشلسٹ معیشت کے لئے ضروری ہے کہ ذرائع دولت و پیداوار پر اجتماعی ملکیت کا اصول نافذ کیا جائے گویا ہمارے لئے سوشلزم لانے کے دو طریقے ہیں ایک یہ کہ ہم اپنے ہر صحت مند فرد کو اس کی صلاحیت کے مطابق کام پر لگائیں اور دوسرے جہاں ضروری ہو وہاں ذرائع دولت و پیداوار کو افراد کے قبضے سے نکال کر اجتماعی ملکیت بنا دیں۔ اپنی زندگی کے ٹھوس حقائق کے پیشِ نظر ہمارے لئے سوشلزم برپا کرنے کا یہی لائحہ عمل ہے اور یہ بجٹ اسی لائحہ عمل کی تفصیلات بیان کرتا ہے چنانچہ جہاں اس کا ایک اہم ترین رکن عوامی تعمیراتی پروگرام ہے وہاں دوسرا اہم ترین رکن سرکاری شعبے میں صنعتوں کا قیام ہے۔ مجھے فخر ہے کہ جو بجٹ میں آج آپ کی خدمت میں رکھ رہا ہوں اس کے قالبوں میں عوام اور عوامی حکومت شانہ بشانہ سوشلزم کی راہ طے کرتے نظر آتے ہیں۔

مگر جناب والا! اقبال نے اپنی پہلی کتاب "علم الاقتصاد" میں جو چبھتا ہوا سوال اٹھایا تھا وہ اب تک ایک چیلنج کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس نے کہا تھا "غریبی قوائے انسانی پر بہت بڑا اثر ڈالتی ہے بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلا آئینے کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے"

اس چیلنج سے عہدہ برآ ہونا اس لئے بھی از حد ضروری ہو گیا ہے کہ وہ جو اقبال کے عہد میں چپکے چپکے کراہ رہے تھے۔ اب ان کی چیخیں فلک شگاف نعرے بن چکی ہیں۔ مفلس و محروم مگر غضب ناک و مشتعل لوگوں کے اس انبوہ کو انتشار اور تباہی کے بجائے تعمیر و ترقی کی راہوں پر ڈالنے کے لئے لازم ہے کہ نظامِ معیشت کو اجتماعی بہبود کے نقطۂ نظر سے ازسرِنو تشکیل دیا جائے یہ کام ہمارے لئے مشکل بھی نہیں اس لئے کہ اقبال نے جہاں یہ چبھتا ہوا سوال اٹھایا تھا وہاں یہ بشارت بھی دی تھی۔

جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

جناب والا! قل العفو کے حرف میں پوشیدہ حقیقت اس دور کے انتخابات میں بہت کھل کر نمودار ہو گئی اور قرآن عظیم کی یہ مبین آیت ایک عوامی مطالبہ بن گئی کہ یسئلونک ماذا ینفقون، قل العفو۔ نبی پاک! آپ کے امتی آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں، فرما دیجئے کہ اپنی ضروریات سے جو کچھ زائد ہو دوسروں پر خرچ کر دیا جائے۔

جناب والا! یوں تو قرآن کا ایک ایک حرف معنی کا سمندر ہے لیکن قرآن کے بارے میں قرآن ہی کا فرمان ہے کہ اس کی ایک آیت اس کی دوسری آیت کی تشریح کرتی ہے۔ عفو کا لفظ قرآن میں ایک اور مقام پر بھی وارد ہوا ہے اور وہاں اس کی شکل "خذ العفو" کی ہے جس کا مطلب ہے کہ جو زائد از ضرورت ہے وہ لے لیا جائے۔ گویا اسلام میں اوّل تو زائد از ضرورت رکھنے کی گنجائش ہی نہیں اور اگر کوئی زائد از ضرورت رکھے تو اس سے چھین لینے کا حکم ہے یہی وہ حکم ہے جس کے تحت ابوبکر صدیق رضی نے کہا تھا کہ اگر کسی پر اونٹ باندھنے کی رسی کے برابر بھی زکوٰۃ واجب ہے تو میری تلوار اس کے خلاف اس وقت تک بے نیام رہے گی جب تک وہ رسی اس سے نہیں لی جاتی مگر لے لینے یا چھین لینے کا عمل افراد کی صوابدید پر نہیں چھوڑا جا سکتا یہ وہ ذمہ داری ہے جو حکومت کو ادا کرنی چاہیئے۔ صدیق اکبر رضی نے بھی یہ ذمہ داری حکومت ہی کی طرف سے ادا فرمائی تھی۔ اسی لئے

آج ہم سوشلزم کے اصول پر ذرائع پیداوار کو حکومت کی تحویل میں لے لینے کی بات کرتے ہیں تو ہمارے دل اس یقین سے معمور ہوتے ہیں کہ ہم اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم نے اس سوشلزم کا اعتراف نہ کیا جس کی گنجائش اسلام نے اپنے اندر رکھی ہے، تو ہمیں ردِّ عمل کے طور پر اس بات کے لئے تیار رہنا چاہیئے کہ جلد ہی غریبوں کا ہاتھ امیروں کی گردن پر ہو گا اور پھر سوشلزم نہیں اس ملک میں کمیونزم آئے گا۔ اس لئے کہ محرومی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو گھٹا دیتی ہے لیکن بڑی بڑی خواہشوں کو بڑھا دیتی ہے ویسے ہی جیسے ہوا موم بتی کے شعلے کو بجھا دیتی ہے لیکن سلگتی ہوئی آگ کو بھڑکا دیتی ہے"۔

ہم اس اقتباس کی طوالت کے لئے قارئین سے معذرت خواہ ہیں لیکن ہمارے نزدیک اس کا پورے کا پورا نقل کرنا ضروری تھا۔

۲. سب سے پہلے ہم محترم حنیف صاحب کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے بالآخر جرأت سے کام لیتے ہوئے "اسلامی سوشلزم" کے اس حریری نقاب کو اتار پھینکا جو غالباً انہی کا وضع کردہ تھا اور جسے اس سے پہلے اس شد و مد سے پیش کیا جاتا تھا۔ اب کے انہوں نے کھلے کھلے الفاظ میں فرما دیا ہے کہ ان کی منزل سوشلزم ہے۔ یہ غالباً اس لئے کہ ان حضرات نے جب بھی "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح استعمال فرمائی، ہم نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ ازراہِ کرم اتنا فرما دیں کہ سوشلزم اور اسلامی سوشلزم میں کیا فرق ہے۔ چونکہ اس سوال کا جواب ان کے پاس کچھ نہیں تھا، اس لئے انہیں اس پر محجوب سا ہونا پڑتا تھا۔ انہوں نے اچھا کیا کہ اس عرق آور نقاب کو اتار پھینکا۔ "بھٹ پڑے وہ سونا جو کانوں کو کھائے"۔

۳. دوسری بات جو صاف ہو کر سامنے آگئی وہ اس سے بھی اہم ہے۔ ان حضرات سے جب بھی سوشلزم کے متعلق بات ہوئی، انہوں نے جواب دیا کہ اس سے ان کی مراد سوشلسٹ نظامِ معیشت ہے، سوشلزم کا نظریۂ زندگی نہیں، جو اسلام کے نظریۂ زندگی کے خلاف ہے۔ چنانچہ زیرِ نظر تقریر میں بھی محترم حنیف صاحب نے پہلے یہی فرمایا کہ

یہ وہی نظامِ معیشت ہے جو اسلام کے اولین دَور میں جلوہ گر ہوا۔

لیکن وہ ہی فقرے آگے چل کر ان کے تحت الشعور میں مضمر حقیقت ابھر کر سامنے آگئی جب انہوں نے کہا کہ

حقیقت یہ ہے کہ اس نظریہ کو قبول کر کے ہم اسلام سے منحرف نہیں ہوتے بلکہ اس کی اصلی پاکیزگی کی جانب لوٹ آتے ہیں۔

یہی بات ہم شروع سے کہتے چلے آ رہے تھے کہ سوشلزم ایک نظامِ معیشت نہیں، یہ ایک نظریۂ زندگی ہے۔ جس پر اس کے نظامِ معیشت کی عمارت استوار ہے اور یہ نظریہ اسلام کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ سوشلزم کا نظریہ کیا ہے۔ اس کی تفصیل ہم اس سے پہلے انہی صفحات پر متعدد بار پیش کر چکے ہیں۔ جسکے دہرانے کی ضرورت نہیں (بطور تجدیدِ یادداشت، صرف لینن کے اس خطاب کے ایک اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں جس سے اس نے یوتھ کمیونسٹ لیگ کی تیسری کانگریس کو مخاطب کیا تھا۔ اس نے کہا تھا:

ہم ان تمام ضوابطِ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی مافوق البشر سرچشمہ یا غیر طبقاتی تصوّر کے پیدا کردہ ہوں۔ ہم اعلانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصوّر فریب ہے، دھوکا ہے یہ

تصور جاگیرداروں اور سرمایہ پرستوں کے مفاد کے تحفظ کی خاطر، محنت کشوں اور کاشتکاروں کے دلوں کو تاریکی اور دھند میں رکھنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ضابطۂ اخلاق محنت کشوں کی طبقاتی جنگ کے مفاد کے تابع ہے یہی ہمارے ضابطۂ اخلاق کا سرچشمہ ہے۔ سرمایہ داروں کا دعویٰ ہے کہ ان کا ضابطۂ اخلاق احکام خداوندی پر مبنی ہے ہم اس تصور کو ٹھکراتے ہیں) ہم خدا وغیرہ کچھ نہیں جانتے ہم اسے مانتے ہی نہیں۔ اخلاق انسانی معاشرہ ہی کا نام ہے اس سے ماوراء جو کچھ ہے فریب ہے۔ ہم کسی ابدی صداقت کے قائل نہیں اس قسم کے اخلاق کے متعلق جس قدر افسانے وضع کئے گئے ہیں، ہم ان سب کا پردہ چاک کر کے رکھ دیں گے۔ (MARX - ENGELS MARXISM, PP. 461--465)

یہ ہے وہ نظریۂ زندگی جس کے متعلق حنیف صاحب فرماتے ہیں کہ

اسے قبول کرنے کے بعد ہم اسلام سے منحرف نہیں ہوتے بلکہ اس کی اصلی پاکیزگی کی طرف لوٹتے ہیں۔

حنیف صاحب اس نظریۂ اخلاق کے آج کے نہیں، مدت کے قائل ہیں (مثلاً) روزنامہ مساوات کی ۲۴ جولائی ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں (جبکہ حنیف صاحب اس کے مدیر تھے) ایک اداریہ شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا "اخلاق حسنہ کا راز" اس میں تحریر تھا:

اخلاق کا تعلق تہذیب سے ہے۔ تہذیب سیاست کا عکس ہوتا ہے اور سیاست پیداواری رشتوں کی ترتیب کا نام ہے ..... اخلاق سدھارنے کے لئے ہمیں پیداواری رشتوں میں انصاف قائم کرنا چاہئے ..... چین کی عظمت، آسودگی اور اخلاق حسنہ کی بنیاد یہی معاشی تبدیلی ہے۔

ہمیں کسی کے عقائد پر معترض ہونے کا کوئی حق نہیں۔ ہر شخص کو آزادی حاصل ہے کہ وہ جس نظریۂ اخلاق کو جی چاہے اختیار کرے۔ لیکن جب کوئی شخص کسی ایسے نظریہ کے متعلق جو کھلے ہوئے کفر اور الحاد پر مبنی ہو، یہ کہے کہ وہ عین اسلام ہی نہیں بلکہ اسلام کی اصلی پاکیزگی کا مظہر ہے، تو اس پر خاموش رہنا بارگاہ خداوندی میں جرم عظیم ہے۔ اسلام کے اس قسم کے مدعیوں سے تو وہ کمیونسٹ ہزار درجہ اچھے ہیں جو سوشلزم کے نظریہ حیات کو کبھی اسلام کہہ کر نہیں پکارتے بلکہ کھلے بندوں اعلان کرتے ہیں کہ ہم مذہب کے دشمن ہیں خواہ وہ اسلام ہو یا کوئی اور مذہب!

۲۔ اشارات سے آگے بڑھ کر اب آئیے اس مقام کی طرف، جہاں حنیف صاحب نے متعین طور پر خود قرآن پر ہاتھ ڈالا ہے۔ ایک پرانا لطیفہ ہے کہ کسی نے ایک تارکِ صلوٰۃ (بے نماز) سے کہا کہ تم نماز کیوں نہیں پڑھتے اس نے جواب دیا کہ جب خود اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ (تم نماز کے قریب مت جاؤ) تو میں نماز کیسے پڑھ سکتا ہوں۔[لہ] یہی کچھ حنیف صاحب نے قرآنی آیات کے ساتھ کیا ہے۔ سوشلزم کا معاشی

لہ قرآن مجید میں ہے کہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنْتُمْ سُکٰرٰی (۴/۴۳) نماز کے قریب نہ جاؤ جب تم نشہ کی حالت میں ہو۔ وہ لطیفہ کے مطابق بے نماز اس آیت کے پہلے حصہ کو پیش کر دیتے ہیں اور دوسرا حصہ گول کر جاتے ہیں۔

نظام یہ ہے کہ سامانِ معیشت میں سے جو کچھ لوگوں کے پاس ہے، اسے ان سے چھین کر حکومت اپنے قبضہ میں لے لے۔ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس سے بڑھ کر ظلم اور استبداد پر مبنی نظام کوئی اور ہو نہیں سکتا کہ حکومت جو کچھ چاہے لوگوں سے چھین کر لے جائے، اور اس طرح لوگوں کے پاس کچھ نہ رہے سب کچھ حکومت کی ملکیت قرار پا جائے۔ دنیا میں فرعونی حکومت کو ظلم و استبداد پر مبنی نظام کے لئے بطور ضرب المثل پیش کیا جاتا ہے اور خود قرآن کریم نے بھی اسے اسی مقصد کے لئے بطور مثال پیش کیا ہے۔ اسی ضمن میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ فرعون کے ظلم و استبداد کا یہ عالم تھا کہ وہ گرجتے برستے ملک کے باشندوں سے کہتا تھا کہ اَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ (۴۳/۵۱) کیا یہ ملک میری ملکیت نہیں اور اس میں بہنے والی نہریں میرے قبضے میں نہیں؟ اور یہ ظاہر ہے کہ اس نے یہ سب کچھ لوگوں کی مرضی سے نہیں لیا تھا۔ ان سے زبردستی چھینا تھا۔ جبھی تو وہ اسقدر ظالم، غاصب اور مستبد قرار پایا اور اس کے دماغ سے اس خناس کو نکالنے اور باطل پر مبنی اس نظام کو الٹنے کے لئے صاحب ضرب کلیمؑ کو وہاں بھیجنا پڑا۔ لیکن حنیف صاحب فرماتے ہیں کہ یہ نظام معیشت جس میں لوگوں سے سب کچھ چھین لیا جاتا ہے خود قرآن کے حکم کے مطابق ہے؛ قرآن کریم (سورہ بقرہ) میں ہے۔ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۔ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹)

اس کا ترجمہ حنیف صاحب کے الفاظ میں یہ ہے۔

> نبی پاک! آپ کے امتی آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں۔ فرما دیجئے کہ اپنی ضروریات سے جو کچھ زائد ہو دوسروں پر خرچ کر دیا جائے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں۔

> یوں تو قرآن کا ایک ایک حرف معنی کا سمندر ہے لیکن قرآن کے بارے میں قرآن ہی کا فرمان ہے کہ اس کی ایک آیت اس کی دوسری آیت کی تشریح کرتی ہے۔ عفو کا لفظ قرآن میں ایک اور مقام پر بھی وارد ہوا ہے اور وہاں اس کی شکل خُذِ الْعَفْوَ[1] کی ہے جس کا مطلب ہے کہ جو زائد از ضرورت ہے وہ لے لیا جائے۔ گویا اسلام میں اوّل تو زائد از ضرورت رکھنے کی گنجائش ہی نہیں اور اگر کوئی زائد از ضرورت رکھے تو اس سے چھین لینے کا حکم ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ

> آج ہم سوشلزم کے اصول پر ذرائع پیداوار کو حکومت کی تحویل میں لے لینے کی بات کرتے ہیں تو ہمارے دل اس یقین سے معمور ہوتے ہیں کہ ہم اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔

اس کا مطلب واضح ہے کہ حکومت کوئی بھی ہو۔ جب وہ ذرائع پیداوار یا لوگوں کے زائد از ضرورت مال ...

---

[1] خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۔ (۷/۱۹۹)

اس آیت میں عفو کے معنی عام طور پر "درگزر کرنا" لئے جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس لفظ کے معنی "زائد از ضرورت مال" کے بھی ہیں اور حنیف صاحب نے انہی معانی کو ترجیح دی ہے اس لئے ہم انہی معانی کے لحاظ سے گفتگو کرتے ہیں۔

دولت کو، ان سے چھین کر اپنے قبضے میں لے لے، تو اس کا یہ فعل اسلام کے عین مطابق ہی نہیں۔ بلکہ اس کی اصل پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا"۔ کیا ہم محترم حنیف ندوی صاحب سے اتنا دریافت کر سکتے ہیں کہ اگر یہ کچھ عین مطابق اسلام اور تعمیلِ ارشادِ خداوندی ہے، تو پھر ظلم؟ غاصب حکومت کسے کہا جائے گا اور سلب و نہب اور رہزنی و قزاقی پر مبنی نظام کا نام کیا رکھا جائے گا؟ توبہ توبہ: انسان جب بھٹکتا ہے تو اپنی گمراہی میں کہاں تک چلا جاتا ہے!!

اس مقام پر اسے بھی ذہن میں رکھیے کہ رسول اللہ صلعم کے اُمتی آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کی ضروریات کے لئے دیدیں۔ جو اُمتی حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں موجود تھے انہیں صحابہؓ کہا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ سوال صحابہؓ کی طرف سے کیا گیا تھا۔ جس کے جواب میں خدا نے اپنے رسول سے کہا تھا کہ ان سے کہدو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے وہ سب۔ اس کے بعد جو (حنیف صاحب کی تفسیر کے مطابق) ہوا۔ یہ کہ بعض صحابہؓ نے اس حکم خداوندی کی تعمیل میں اپنا زائد مال حضورؐ کو دے دیا اور بعض نے نہ دیا۔ جنہوں نے نہ دیا ان کے متعلق خدا کو مزید حکم نازل کرنا پڑا کہ ان سے ان کا مال زبردستی چھین لو۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ نے صحابہؓ سے وہ مال چھین لیا تھا۔

سبحان اللہ! کیا نقشہ پیش کیا جا رہا ہے اس معاشرہ کا جس کے متعلق ہم دنیا سے کہتے ہیں کہ اس کی مثال آسمان کے نیچے کہیں نہیں ملے گی! لیکن حنیف صاحب کا مقصد تو اپنی سوشلزم کی چھینا جھپٹی کو "اسلامی" ثابت کرنا ہے۔ انہیں اس سے کیا غرض کہ ان کے نشتر کی نوک کہاں تک پہنچتی ہے!

۵۔ اس باب میں وہ یہیں تک ہی نہیں رہے۔ آگے بھی بڑھتے ہیں اور "چھینا جھپٹی" کی تائید میں خلافتِ راشدہ کے عمل سے ایک نظیر بھی ڈھونڈ لاتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

> یہی (چھین لینے کا) وہ حکم ہے جس کے تحت ابوبکر صدیقؓ نے کہا تھا کہ اگر کسی پر اونٹ باندھنے کی رسّی کے برابر بھی زکوٰۃ واجب ہے تو میری تلوار اس کے خلاف اس وقت تک بے نیام رہے گی جب تک وہ رسّی اس سے نہیں لی جاتی۔ مگر لے لینے یا چھین لینے کا عمل افراد کی صوابدید پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ یہ وہ ذمہ داری ہے جو حکومت کو ادا کرنی چاہیئے۔ صدیق اکبرؓ نے بھی یہ ذمہ داری حکومت ہی کی طرف سے ادا فرمائی تھی۔

محترم حنیف صاحب کے متعلق ہمارا حسنِ ظن تھا کہ وہ کم از کم اسلام کی تاریخ سے واقف ہوں گے لیکن ان کے ان ارشادات نے یہ پردہ بھی اٹھا دیا۔ آیئے ہم دیکھیں کہ اصل واقعہ کیا تھا۔

رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد بعض قبائل کی طرف سے حکومت کے خلاف بغاوت کے شعلے ابھرے۔ مشہور مصری مؤرخ محمد حسین ہیکل (مرحوم) حیاتِ صدیق اکبرؓ میں لکھتے ہیں۔

لـہ یعنی اگر ایک فرد کسی سے کچھ چھین لے تو اسے قزاقی یا ڈکیتی کہا جائیگا اور اگر افراد کی ایک جماعت (جسے پھر حکومت کہا جاتا ہے) ٹھوک کے بجائے لوگوں سے سب کچھ چھین لے تو وہ عین مطابق اسلام ہوگا!!

یہ لوگ آپس میں کہتے تھے کہ مہاجرین اور انصار چونکہ خلافت کے بارے میں جھگڑا کر چکے ہیں۔ اور رسول اللہؐ نے وفات سے قبل کسی شخص کی خلافت کے متعلق وصیت نہیں کی۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم اسلام پر قائم رہتے ہوئے (اپنی) خود مختاری کی حفاظت کریں۔ ہمیں یہ حق ہونا چاہیئے کہ انصار و مہاجرین کی طرح ہم بھی اپنے میں سے کسی شخص کو اپنا امیر مقرر کرلیں جو ہمارے لئے جانشین رسول اللہ کے طور پر ہو۔ ابوبکرؓ یا ان کے سوا کسی اور کی اطاعت سے متعلق نہ دین میں کوئی نص موجود ہے اور نہ کتاب اللہ سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ اس لئے ہم پر صرف اس شخص کی اطاعت واجب ہے جسے ہم خود اپنا امیر مقرر کرلیں (اردو ترجمہ شائع کردہ مکتبہ جدید ص ۱۷۳-۱۷۴)

آپ نے دیکھا کہ یہ وہ لوگ تھے جو مملکت اسلامیہ کے اندر رہتے ہوئے اس کے بالمقابل اپنی الگ خود مختار حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس بغاوت کا آغاز انہوں نے اس طرح کیا کہ مملکت کے واجبات کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔ (دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں یوں سمجھیئے گویا انہوں نے اس کی ابتدا NO-TAX CAMPAIGN) سے کردی) وہ کہتے تھے کہ موجودہ حکومت کے واجبات ان پر تاوان ہیں اور

رسول اللہؐ کی وفات کے بعد اہل مدینہ کے مقرر کردہ امیر کو ان سے "زکوٰۃ" یا بالفاظ دیگر ادائے تاوان کے مطالبہ کا کوئی اختیار نہیں۔ چنانچہ (انہوں نے) "زکوٰۃ" سے انکار کرتے ہوئے اعلان کر دیا کہ نہ وہ ابوبکرؓ کو اپنا امیر تسلیم کرتے ہیں اور نہ ان کے احکام کی بجا آوری کو ضروری سمجھتے ہیں (ص ۱۸۴)

اس کے بعد

انہوں نے مدینہ پر چڑھائی کر دی اور تہیہ کر لیا کہ خلیفہ سے اپنی بات منوا کر ہی واپس جائینگے (ص ۱۸۴)

یہ تھے وہ باغی جن کے خلاف سربراہ مملکت اسلامیہ حضرت صدیق اکبرؓ نے جہاد کا فیصلہ کیا تھا، اور چونکہ انہوں نے آغاز بغاوت حکومت کے واجبات کی ادائیگی کے انکار سے کیا تھا۔ اس لئے آپ نے فرمایا تھا کہ

واللہ! اگر منکرین زکوٰۃ مجھے ایک رسّی دینے سے بھی انکار کریں گے جسے وہ رسول اللہؐ کے زمانے میں ادا کیا کرتے تھے تو بھی میں ان سے جنگ کروں گا۔ (ص ۱۸۵)

آپ نے غور فرمایا کہ یہ لوگ مرکزی حکومت کے مقابل اپنی خود مختار حکومت قائم کرنے کے لئے اٹھے تھے اور ان کی اسی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے حضرت ابوبکرؓ نے اعلان جنگ کیا تھا۔

یہ ہے وہ واقعہ جسے علامہ صاحب اپنے اس دعوٰے کی تائید میں بطور نظیر پیش فرما رہے ہیں کہ قرآن کی رو سے ہر حکومت کو اس کا حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ لوگوں سے ان کا زائد از ضرورت مال چھین لے۔

ضمناً یہ لوگ کہتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں، مسلمان رہنا چاہتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم ادائیگی صلوٰۃ کرتے ہیں۔ البتہ ہم مرکزی حکومت کو اس کے واجبات (زکوٰۃ) ادا نہیں کریں گے۔ اس کے جواب میں حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا تھا کہ

واللہ! میں صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں فرق کرنے والے لوگوں سے ضرور لڑوں گا۔ (ص ۱۸۶)

ہم محترم حنیف ندوی صاحب سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ "زکوٰۃ کی ایک رسّی" کے لئے جنگ کرنے کو تو اسلامی حکم قرار

دیتے ہیں، کیا ان کی سوشلزم میں۔ صلوٰۃ کے متعلق بھی اس قسم کا کوئی حکم ہے؟ اگر وہ "صلوٰۃ اور زکوٰۃ" میں فرق کرتے ہیں تو پھر اس باب میں جناب صدیق اکبرؓ کے مندرجہ بالا فیصلہ کے بارے میں ان کا کیا ارشاد ہے؟

۶۔ یہ تھا محترم حنیف رامے صاحب کے ارشادات کا ایک طائرانہ جائزہ۔ آئیے اب دیکھیں کہ قرآن کریم کا اس باب میں کیا ارشاد ہے۔

۱۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ یہ درست ہے کہ قرآن کریم اپنی بعض آیات کی تشریح دوسری آیات سے کرتا ہے۔ (رامے اس لئے تصریف آیات سے تعبیر کیا ہے) لیکن تصریف آیات سے اتنا ہی مقصود نہیں کہ مثلاً قل العفو میں "عفو" کا لفظ آیا ہے۔ تو ہم کوئی سی دوسری آیت (مثلاً خذ العفو) لے لیں اور کہہ دیں کہ اس سے قل العفو کی تشریح ہو گئی۔ تصریف آیات سے مراد یہ ہے کہ کسی ایک موضوع سے متعلق قرآن کریم میں جس قدر آیات آئی ہیں ان سب کو (ان کے سیاق و سباق کے ساتھ) سامنے رکھا جائے۔ اسطرح یہ واضح ہو جائے گا کہ اس موضوع کے متعلق قرآنی تعلیم یا فیصلہ کیا ہے۔ معاشیات ایک مخصوص اور جامع موضوع ہے اور قرآن کریم میں سینکڑوں ایسی آیات آئی ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس موضوع سے متعلق ہیں۔ ان تمام آیات کو ایک ترتیب کے ساتھ سامنے رکھنے سے قرآن کا معاشی نظام مرتب ہو جاتا ہے۔ ہم اس نظام کو (ایک سے زیادہ مرتبہ) ان صفحات پر پیش کر چکے ہیں۔ اس لئے اس جگہ ان تمام آیات کا اعادہ ضروری نہیں۔ اس مقام پر ہم اس کا صرف ملخص پیش کرتے ہیں۔

۲۔ یہ بھی درست ہے کہ قرآنی نظام میں نہ ذرائع پیداوار افراد کی ملکیت میں رہتے ہیں، نہ ان کی ضروریات سے زائد مال ان کے قبضے میں۔ یہ حکومت کی تحویل میں رہتے ہیں۔ لیکن ان ذرائع پیداوار کو، نہ تو ہر حکومت اپنے قبضے میں لے لیتی ہے اور نہ ہی حکومت کو اس کا حق حاصل ہوتا ہے کہ انہیں لوگوں سے زبردستی چھین لے۔ قرآن کریم پہلے یہ متعین کرتا ہے کہ وہ حکومت کس قسم کی ہوتی ہے جسے ان کے لینے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ افراد کس پاکیزگی سیرت اور بلندی کردار کے حامل ہوں جو اس حکومت کو قائم کرتے اور اس کے نظم و نسق کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ وہ اس حکومت کی خصوصیات و امتیازات کو نہایت وضاحت سے بیان کرتا ہے تاکہ اس باب میں کسی قسم کا اشتباہ یا التباس نہ رہے، اور اسطرح ہر حکومت (قرآن کی ایک آدھ آیت پیش کر کے) انہیں اپنے قبضے میں لے لینے کی مدعی نہ بن بیٹھے۔ (ہم اس حکومت کو بغرض تعارف، قرآنی حکومت کہہ کر پکارتے ہیں) اس حکومت (یا مملکت یوں کہئے کہ اس نظام) کے متعدد گوشے ہیں لیکن چونکہ اسوقت موضوع زیر نظر معاشیات ہے اس لئے ہم اس کے صرف اسی پہلو سے متعلق قرآنی اصول پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ (طلوع اسلام میں قرآن کے سیاسی نظام کے متعلق بھی شرح و بسط سے لکھا جا چکا ہے۔)

۳۔ قرآن کریم اس حکومت کے "حقوق" بیان کرنے سے پہلے، اس کی ذمہ داریوں کو نمایاں طور پر سامنے لاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم زندگی کے ہر گوشے میں، حقوق سے پہلے ذمہ داریوں کو اجاگر کرتا ہے، اس لئے کہ حقوق، درحقیقت فرائض یا ذمہ داریوں کی ادائیگی ہی سے وجود میں آتے ہیں۔ جہاں تک معاشیات کا تعلق ہے وہ کہتا ہے کہ اس حکومت کو اپنی اس ذمہ داری کا اعلان کرنا ہو گا کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (۶/۱۵۱)۔

ہم تمہارے رزق (ضروریات زندگی) کے مہیا کرنے کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

دوسرے مقام پر اس نے یہاں تک بھی کہہ دیا ہے کہ یہ ذمہ داری انسانوں کے رزق تک ہی محدود نہیں۔ یہ اس مملکت کی حدود میں بسنے والے تمام ذی حیات کو محیط ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا۔ (۱۱/۶) اس نظام کی یہ ذمہ داری محض آئین و قوانین کے اوراق تک محدود نہیں رہتی۔ حکومت اگر اس کی ادائیگی میں قاصر رہے تو اس کی باز پرس کی جا سکتی ہے۔ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُولًا (۱۷/۳۳) یہی وہ بازپرس تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرتؓ نے فرمایا تھا کہ

جس بستی میں کسی ایک شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا، اس بستی سے اللہ تعالیٰ کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے (مسند امام احمد)

اور حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ

اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر جائے تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہو گی (توفیق الرحمٰن)

اور اس احساس کی شدت کا یہ عالم تھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں وصیت کی کہ میں نے بیت المال سے جو وظیفہ لیا ہے اسے واپس کر دیا جائے اس لئے کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ جن خدمات کے عوض وہ وظیفہ مجھے ملتا تھا میں انھیں کما حقہ سرانجام دے سکا ہوں یا نہیں۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ وہ وظیفہ کسقدر ہوتا تھا؟ اسے حضرت عمرؓ کے الفاظ میں سنئے۔

کپڑوں کے دو جوڑے، ایک جاڑے کا ایک گرمی کا۔ حج اور عمرہ کے لئے ایک احرام۔ میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے فی کس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے۔ نہ اس سے زیادہ، نہ اس سے کم۔ اس کے بعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں۔ جو ان کا حال سو میرا حال (عمر فاروقؓ۔ از ہیکل)

حکومت سے اس کی ذمہ داریوں کی باز پرس اس دنیا میں بھی ہوتی تھی اور آخرت میں بھی۔ دنیاوی باز پرس سے عہدہ برا ہونے کے بعد، اُخروی باز پرس کے احساس کا یہ عالم تھا کہ حضرت عمرؓ اپنی شہادت کے وقت رو رہے تھے اور ایک تنکا اٹھا کر بار بار کہتے تھے کہ کاش میں امیر المومنین ہونے کے بجائے گھاس کا یہ تنکا ہوتا، تاکہ اُخروی باز پرس سے محفوظ رہتا۔ (یاد رکھئے! یہ ایمان بالآخرت، یعنی کائنات عمل کے قانون خداوندی پر ایمان ہے جو بنیاد ہے کسی نظام کے اسلامی ہونے کی اور ضمانت ہے اس کی کامیابی کی۔ اور یہی وہ ایمان ہے۔ جسے مٹانے پر سوشلزم فخر کرتی ہے) جہاں تک دنیاوی باز پرس کا تعلق ہے۔ قرآنی مملکت کے ہر فرد کے لئے حکومت سے باز پرس کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے اور اگر حکومت اس کے باوجود اپنی ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے سے قاصر رہتی ہے تو اس کی اطاعت کا جوا افراد معاشرہ کی گردن سے اتر جاتا ہے۔ اس لئے کہ حکومت کی طرف سے اس ذمہ داری کی عدم ادائیگی احکام خداوندی کی معصیت ہے، اور قرآن کریم کی رُو سے اطاعت، معروف کی ہے۔ معصیت کی نہیں۔ یہ وہ بنیادی شرط ہے۔ جسے قرآن کریم نے "بیعتِ اطاعت" میں بصراحت شامل کیا ہے جب کہا ہے کہ جب یہ لوگ حکومت کے فرماں پذیری کا اقرار کریں (اسے بیعت اطاعت کہا جاتا ہے) تو یہ کہیں کہ لَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ (۶۰/۱۲)

تاہم معروف میں تمہاری نافرمانی نہیں کریں گے[^1] اسی بناء پر خلفائے راشدین رضؓ اپنے اوّلین خطبات خلافت میں اعلان کیا کرتے تھے کہ

تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں۔ لیکن اگر مجھ سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جس سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔

(خطبہ خلافت حضرت ابوبکر صدیقؓ)

اور اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے اس حکومت سے یہ کہا تھا کہ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ (۷/۱۹۹) تم ہمیشہ ان امور کا حکم دیا کرو جنہیں قوانینِ خداوندی صحیح اور جائز قرار دیتا ہو۔ المعروف یا عرف کے یہی معنی ہیں۔ ضمناً یہ اسی آیت کے اگلے دو لفظ ہیں جس کے پہلے دو لفظ ۔ خُذِ الْعَفْوَ ۔ حنیف صاحب نے (QUOTE) کئے ہیں۔ یعنی انہیں اس آیت میں صرف خُذِ الْعَفْوَ نظر آیا۔ اگلے دو لفظ ۔ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ ۔ دکھائی نہ دیئے، اس لئے کہ اس سے ان کا تعمیر کردہ سارا گھروندہ ڈھیر ہو کر رہ جاتا تھا۔ خُذِ الْعَفْوَ ۔ صرف اس حکومت کے لئے ہے جو وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ پر عمل پیرا ہو۔ جو حکومت ایسا نہیں کرتی اسے کچھ لینے کا حق حاصل ہونا تو ایک طرف، قرآن کی رو سے اس کی اطاعت بھی باقی نہیں رہتی اسی کی صراحت حضرت صدیقِ اکبرؓ نے اپنے اوّلین خطبہ خلافت میں فرمائی تھی۔

۶۔ تصریحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ذرائع پیداوار وہی حکومت اپنی تحویل میں لے سکتی ہے جو افراد معاشرہ کے رزق (یعنی سامانِ زیست مہیا کرنے) کی ذمہ داری لے اور معروف کا حکم دے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل سوال یہ نہیں کہ ذرائع پیداوار کس کی تحویل میں رہیں۔ قرآنی حکومت پر افراد معاشرہ کے رزق کی بہم رسانی کا فریضہ عائد ہوتا ہے اور وہ اس فریضہ کی ادائیگی سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتی ہے جب ذرائع پیداوار اس کی تحویل میں رہیں۔ گویا ذرائع پیداوار کا حکومت کی تحویل میں رہنا مقصود بالذات نہیں۔ یہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ مقصد ہے افرادِ معاشرہ کے رزق کی بہم رسانی۔ یہ بھی واضح رہے کہ قرآنی نظام میں افرادِ معاشرہ کو صرف رزق حاصل نہیں ہوتا۔ رزقِ کریم حاصل ہوتا ہے یعنی وہ رزق جس کے ساتھ شرف و احترامِ انسانیت اور عزت و آبرو سے آدمیت قائم رہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآنِ کریم کی رو سے رزق کی تنگی خدا کا عذاب ہے۔ لیکن وہ اسے بھی واضح کر دیتا ہے کہ جو معاشرہ اقدارِ خداوندی کے تابع نہ رہے اس میں رزق کی فراوانی بھی تباہی کا موجب ہو جاتی ہے۔ (۱۶/۱۱۲)

قرآنِ کریم نے جس ذمہ داری کو قرآنی نظامِ مملکت کا فریضہ قرار دیا ہے، سوشلزم اس کے قریب تک نہیں آتی۔ ہمارے ملک میں تو یہ سوشلزم کا دعویٰ محض فیشن کے طور پر کیا جاتا ہے۔ جن اقوام کا اس پر ایمان ہے اور انہوں نے اسے اپنے ہاں عملاً رائج کر رکھا ہے وہ بھی اس ذمہ داری کو قبول نہیں کرتیں۔ مارکس کے الفاظ میں یہ ذمہ داری ہے (TO EACH ACCORDING TO HIS NEEDS)۔

سوشلسٹ کہتے ہیں کہ یہ اب کمیونزم میں جا کر ہو سکے گا اور کمیونزم کا نظام قائم کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔

---

[^1]: ان امور کی وضاحت کسی دوسرے وقت کی جائے گی۔

یہ اعترافِ عجز دورِ حاضر کے سوشلسٹوں تک محدود نہیں۔ مارکس۔ لینن۔ سٹالن ہر ایک نے اس کا اعتراف کیا تھا۔ مارکس تو اپنے رفقا کو اس موضوع پر گفتگو کرنے کی بھی اجازت نہیں دیا کرتا تھا۔[1] اس وقت دنیا میں سوشلزم کا نظام جاری ہے (یا اسے جاری کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے) یہ نظام اتنا ہی جانتا ہے کہ ذرائع پیداوار کو اپنے قبضہ میں لے لینا اور لوگوں سے ان کا مال و دولت چھین لینا سوشلزم ہے۔ باقی رہا لوگوں کے رزق کی ذمہ داری سو وہ کمیونزم میں جا کر ہو گا اور کمیونزم کے متعلق لینن نے کہا تھا کہ

> نوعِ انسان کن مراحل سے گزر کر اور کن عملی اقدامات کی رو سے اس بلند مقصد کو حاصل کر سکے گی۔ اس کی بابت ہم نہ کچھ جانتے ہیں، نہ جان سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے پاس کوئی مواد ایسا نہیں جس سے ان سوالات کا جواب دیا جا سکے (اسلامی سوشلزم ص۱۷)

یہاں تک ہم نے اس نکتہ سے بحث کی ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے وہ کونسی حکومت ہے جسے اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ذرائع پیداوار کو اپنی تحویل میں لے لے۔ اب آیئے افراد معاشرہ کے مال و دولت کی طرف۔

قرآن کریم افراد معاشرہ اور نظام معاشرہ کے ربط و تعلق کی بنیاد ایک معاہدہ پر استوار کرتا ہے جسے وہ معاہدہ بیع و شریٰ (خرید و فروخت) سے تعبیر کرتا ہے۔ اس معاہدہ کا عنوان خود اس حقیقت کی وضاحت کر دیتا ہے کہ اس میں جبر و استحصال اور جور و استبداد کا کوئی سوال نہیں۔ "خرید و فروخت" کا معاملہ تراضیٔ طرفین کی رُو سے طے پاتا ہے جو چیز خریدی جائے اسے "چھینا" نہیں کہا جاتا اور جو کچھ "چھینا" جائے اسے خریدنا نہیں قرار دیا جاتا۔ اس معاہدہ میں خریدار (مشتری) خدا (عملاً نظام حکومتِ خداوندی) ہوتا ہے اور فروخت کنندہ (بائع) افرادِ معاشرہ۔ اسلامی نظامِ سیاست میں حلفِ وفاداری (OATH OF ALLEGIANCE) کو جو "بیعت" کے لفظ[2] سے تعبیر کیا جاتا ہے تو وہ اس معاملہ بیع و شریٰ کی محسوس شکل ہوتی ہے۔ اس معاہدہ کی رُو سے:

> اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹/۱۱۱)
>
> خدا جماعت مومنین سے ان کی جانیں اور ان کا مال و دولت خرید لیتا ہے اور اس کے عوض انہیں جنت عطا کر دیتا ہے۔

جماعتِ مومنین کو یہ قیمتِ فروخت، یعنی الجنۃ آخرت میں جا کر ہی نہیں ملتی، دنیا اور آخرت، دونوں جہانوں میں ملتی ہے۔ جہاں تک دنیاوی جنت کا تعلق ہے اس کی ابتدائی (اور پست ترین) سطح یہ ہے کہ اس میں کسی کو نہ بھوک پیاس کی طرف سے عدم اطمینان ہوتا ہے، نہ لباس اور مکان کی طرف سے کوئی تشویش یا پریشانی (۲۰/۱۱۸) جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ اس الجنۃ کی بالکل ابتدائی اور پست ترین سطح ہے آگے چل کر اس میں وہ تمام نعمتیں اور آسائشیں آ جاتی ہیں۔ جن کا انسان تصور کر سکتا ہے۔ بلکہ قرآن تو یہ بھی کہتا ہے کہ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے پرویز صاحب کا مقالہ "اسلامی سوشلزم" شائع شدہ طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۷۲ء

[2] اب یہ بیعت رسم مخالفانہ بیعت بن کر رہ گئی ہے۔

(۱۰/۵۸) اس میں انہیں وہ سب کچھ ملے گا جس کی وہ آرزو کریں گے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ بایں ہمہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ قرآن کریم کے نزدیک انسانی زندگی کا مسئلہ "روٹی کپڑا مکان" ہی نہیں۔ یہ اس کی طبیعیاتی زندگی کے تقاضے ہیں جن کا پورا ہونا ضروری ہے لیکن انسان کی حقیقی زندگی کی سطح اس سے کہیں بلند ہے اور الجنۃ میں ان طبیعی ضروریات کے ساتھ وہ سامان و ذرائع بھی میسر آتے ہیں جن سے انسان کی اس بلند سطح کی زندگی کی نشوونما ہوتی ہے۔ سوشلزم کی انتہائی شکل کمیونزم تک میں انسان کی صرف طبیعی زندگی کے تقاضوں کی تسکین کو منتہیٰ قرار دیا جاتا ہے، لیکن قرآن کی رو سے ان تقاضوں کا پورا ہونا مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ بلند مقصد ہے انسان کی انسانی زندگی (یعنی انسانی ذات) کی نشوونما۔ سوشلزم یا کمیونزم، انسان کی اس بلند زندگی کے وجود تک کو تسلیم نہیں کرتی۔

ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قرآنی معاشرہ میں، فرد اور نظام کا تعلق "بیع و شریٰ کا معاہدہ" ہوتا ہے جس میں کسی قسم کی چھینا جھپٹی کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جنت کے متعلق کہا گیا ہے کہ فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَلَا هَضْمًا (۲۰/۱۱۲) اس میں کسی کو نہ کسی قسم کے جور و استبداد کا خوف ہوگا نہ کسی طرح کے سلب و نہب، (چھینے جھپٹنے) کا ڈر۔ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَلَا رَهَقًا (۷۲/۱۳) نہ کسی کو اس کا خطرہ ہوگا کہ اس کے حقوق میں کسی قسم کی کمی ہوگی، نہ اس کا احتمال کہ کوئی اسے ذلیل اور رسوا کر سکے گا۔ یہ ہوگا نتیجہ بیع و شریٰ کے اس معاملہ کا جو افراد معاشرہ کی کامل رضامندی سے عمل میں آئے گا۔ "چھینا جھپٹی" تو ایک طرف یہ وہ معاملہ ہوگا جس کی تکمیل پر افراد معاشرہ مسرتوں کے شادیانے بجائیں گے (فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ (۹/۱۱۱)

آپ سوچئے کہ ان حالات میں 'خُذِ الْعَفْوَ' کے کبھی یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ "اے رسول! ان سے ان کا زائد از ضرورت مال چھین لو"! حنیف صاحب کے سر پر سوشلزم کے "چھیننے" کی دھن اس حد تک سوار ہے کہ وہ قرآنی آیت کے ترجمہ تک کو مسخ کر دینے میں بھی کوئی باک نہیں سمجھتے۔ آئیے ہم دیکھیں کہ اس آیت کا صحیح ترجمہ اور مفہوم کیا ہے۔

خُذْ کا لفظ اسی آیت میں نہیں آیا اور بھی متعدد مقامات پر آیا ہے۔ ہم ان میں سے صرف دو ایک آیات یہاں پیش کرتے ہیں۔

(۱)۔ اسلامی نظام کے ابتدائی دور میں جب ہنوز العفو کی سٹیج نہیں آئی تھی، افراد معاشرہ عطیات پیش کرتے تھے انہیں قرآنی اصطلاح میں صدقات کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ ان صدقات کے متعلق حضورؐ سے کہا گیا کہ خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً۔ "یہ لوگ جو مالی عطایا پیش کرتے ہیں، اے رسول! انہیں قبول کر لیا کرو" اس کے بعد ہے۔ وَصَلِّ عَلَيْهِمْ۔ اور اس کے لئے انہیں شاباش بھی دیا کرو۔ اس لئے کہ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (۹/۱۰۳) تیری شاباش ان کے لئے وجہ تسکین ہوتی ہے"۔ اس آیت میں خُذْ کا ترجمہ "چھین لو" کیجئے اور پھر دیکھئے کہ بات کیا بنتی ہے؟ ہم نے "خُذْ" کا جو ترجمہ "قبول کر لو" کیا ہے تو یہ خود قرآنی الفاظ پر مبنی ہے۔ اسی سورۃ میں ذرا پہلے منافقین کا ذکر ہے جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ قُلْ أَنْفِقُوا

اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ (۹/۵۳) تم طوعًا و کرہًا جس طرح بھی چاہے یہ پیش کش کرو۔ تمہارے عطایا قبول نہیں کیے جائیں گے۔"

آ۔ ایک اور آیت اس سے بھی واضح تر ہے۔ اس میں مالِ فے کی تقسیم کا ذکر ہے اور اس سلسلہ میں لوگوں سے کہا گیا ہے کہ

مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (۵۹/۷)

(مالِ فے میں سے) جو کچھ تمہیں رسول عطا کرے، اسے قبول کر لیا کرو۔ اور جس سے تمہیں روک دے اس سے رُک جایا کرو۔

ان آیات سے خُذْ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ اس لفظ کے یہی معنی خُذِ الْعَفْوَ میں ہیں۔ پہلی آیت (۲/۲۱۹) میں کہا گیا ہے کہ اے رسول! یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ اب (اس نظام کے آخری دور میں) ہم کسقدر خود رکھ لیا کریں۔ اور کسقدر دوسروں کے لئے دیدیا کریں۔ ان سے کہدو کہ جسقدر شبانہ ضروریات سے زائد ہے وہ سب دیدیا کرو۔ یہ حکم دینے والوں کے لئے تھا لیکن چونکہ یہ "دینا اور لینا" انفرادی نہیں تھا اجتماعی تھا۔ اس لئے اس کے ساتھ ہی سربراہ مملکت سے فرمایا کہ خُذِ الْعَفْوَ (۷/۱۹۹) یہ لوگ جب اپنا زائد از ضرورت مال لاکر پیش کریں تو اسے قبول کر لیا کرو (اور اس کے ساتھ ہی وہ پہلی تاکید کہ) اس کے لئے انہیں شاباش بھی دیا کرو۔

یہ ہیں وہ آیات جن کی رُو سے حنیف صاحب سوشلزم کے اس مسلک کی تائید میں "نصوص قرآنی" پیش کرتے ہیں کہ حکومت کو حق پہنچتا ہے کہ جو کچھ کسی کے پاس ہو اسے اس سے چھین لے۔ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ سوشلزم کے نظریہ زندگی کی رُو سے، انسان کے قلب میں کوئی ایسا جذبہ محرکہ نہیں ہوتا جس سے وہ اپنا سب کچھ (زائد از ضرورت) دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے برضا و رغبت دیدے اس لئے اس نظام میں استبداد اور تشدد کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں رہتا۔ چنانچہ لینن کو اس کا اعلان کرنا پڑا کہ

انقلاب ایک ایسا عمل ہے جس کی رُو سے آبادی کا ایک حصہ دوسرے حصے پر اپنا اختیار و تسلط، قوت و استبداد، لوک شمشیر، گولیوں کی بوچھاڑ اور آتشیں گولوں کے دھماکے سے زبردستی کراتا ہے

(STATE AND REVOLUTION)

اور یہ تشدد اور استبداد، ایک ڈکٹیٹر کے زیر کمان ہوتا ہے جس کے متعلق سٹالن نے اپنی کتاب (LENINISM) میں لکھا ہے کہ

ڈکٹیٹر ایسی مقتدر عام ہستی کا نام ہے جس کا وجود دیگر قوت پر مبنی ہو۔ ایسی مطلق العنان ہستی جو کسی قانون اور کسی ضابطہ کی پابند نہ ہو۔ آئینی نظامِ حکومت کے علمبردار سن لیں اور اچھی طرح سن لیں کہ ڈکٹیٹرشپ کے معنی ہیں قوت، غیر محدود قوت اور قاہرہ قوت جو جبر و اکراہ پر مبنی ہو اور جسے آئین و دستور اور قانون و شریعت سے کچھ واسطہ نہ ہو۔

اس کے برعکس قرآنی نظام کی بنیاد اس ابدی اور غیر متبدل اصول پر اٹھتی ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۲/۲۵۶)

اس نظام میں جبر و اکراہ کا کوئی سوال نہیں۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے۔ اسلامی معاشرہ مشتمل ہوتا ہے ان افراد پر جو "بیع و شریٰ" کے معاہدہ کے مطابق اپنا جان و مال، بطیبِ خاطر، نظامِ خداوندی کے سپرد کر دیں۔ ظاہر ہے کہ معاشرہ میں ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو معاشرہ کے نظام کو بطیبِ خاطر قبول کر لینے کے باوجود قانون شکنی کرتے ہیں۔ انہیں مجرم کہا جاتا ہے اور ان سے قانون کی اطاعت، قانونی قوت کی رُو سے کرائی جاتی ہے۔ لیکن یہ استثنائی شکل ہوتی ہے۔ عام افراد معاشرہ سے چھین کر کچھ نہیں لیا جاتا۔

لیکن اگر اس معاشرہ میں کوئی ایسا گروہ پیدا ہو جائے جو مملکت کے بنیادی اصولوں ہی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے تو اسے بغاوت کہا جائے گا۔ ان کے لئے دو راستے کھلے ہوں گے۔ یا تو وہ معاشرہ کا جزو رہتے ہوئے اس معاشرہ کے اصولوں کی پابندی کریں۔ اور یا اس معاشرہ کو چھوڑ کر غیر مسلموں کے زمرہ میں شامل ہو جائیں۔ اس صورت میں ان پر وہ قانون لاگو ہوگا جس کے تابع غیر مسلم اسلامی مملکت میں زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ لیکن اگر وہ نہ تو اس دین کو چھوڑیں۔ اور نہ ہی اس کے اصولوں کو ضابطۂ زندگی تسلیم کریں تو یہ وہ بغاوت ہوگی جسے بزورِ شمشیر فرو کیا جائے گا۔ (یہ تھی وہ صورت جو حضرت صدیقِ اکبرؓ کے دورِ خلافت میں پیدا ہو گئی تھی اور جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے)

ان صورتوں کے سوا اسلامی نظام میں افرادِ معاشرہ کے خلاف نہ جبر و اکراہ کا سوال پیدا ہوگا۔ نہ استبداد اور تشدد کی ضرورت۔ یہ معاشرہ ان افراد پر مشتمل ہوگا جن کے متعلق قرآن بار بار دہراتا ہے کہ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ۔ خدا ان سے راضی۔ وہ خدا سے راضی۔ اس قسم کے تراضی مابین میں "چھینے" کا کیا سوال؟ ان کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ يُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔ (۵۹/۹) وہ خود تنگی میں گزارہ کر لیتے ہیں لیکن دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں۔

۷۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ دنیا میں نہ کہیں قرآنی نظام رائج ہے اور نہ ہی کہیں قرآنی مسلمان بستے ہیں بلکہ یہ "مسلمانوں" کی ہیں اور مسلمان اس لئے مسلمان کہلاتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے گھر پیدا ہو گئے۔ ان میں نظامِ سرمایہ داری کے مؤید بھی ہیں اور سوشلسٹ اور کمیونسٹ بھی۔ سیکولرزم اور مغربی جمہوریت کے قائل بھی ہیں اور وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دینے کے مدعی بھی۔ ان میں وہ بھی ہیں جو نسل یا زبان کی بنا پر جداگانہ قومیتوں کے قائل ہیں۔ اور وہ بھی جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے اختلاط سے متحدہ قومیت کے مدعی ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جو سرے سے خدا ہی کے منکر ہیں اور کسی قانون، اصول یا قدر کو ابدی اور غیر متبدل تسلیم نہیں کرتے یعنی وحی کی صداقت کے بھی قائل نہیں۔ اس کے باوجود یہ سب مسلمان کہلاتے ہیں۔ حالانکہ وہ نظریات جن کے یہ قائل ہیں، قرآن کریم کی واضح تعلیم کے خلاف ہیں۔

مسلمانوں کے ان ممالک میں مختلف قسم کے سیاسی اور معاشی نظام رائج ہیں اور کسی کو اس کی پرواہ نہیں کہ قرآن ان نظاموں کے متعلق کیا کہتا ہے۔ ایسا کرنے کی وہ ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ ان کے نظام ان کے اقتدار کے زور پر قائم ہیں اور انہیں ضرورت صرف اس امر کی ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان کا اقتدار قائم رہے۔ پاکستان

بھی انہی ممالک میں سے ایک ہے اور یہاں کے برسرِ اقتدار طبقہ کو اس کا اختیار حاصل ہے کہ وہ جس قسم کا نظام جی چاہے یہاں نافذ کرے۔ ہم ان کے اس اختیار کو چیلنج نہیں کرنا چاہتے۔ ہماری گزارش صرف اسقدر ہے۔ کہ ایسا کرنے میں وہ قرآن کو بیچ میں نہ لائیں۔ اس کی وجہ صاف ہے۔ قرآن کی بات کرنے کا حق قرآنی حکومت کو پہنچتا ہے اور قرآنی حکومت اسے کہتے ہیں جس کا پورے کا پورا نظام قرآن کے تابع ہو۔[1] کوئی ایک مسئلہ تو ایک طرف، اگر کسی حکومت کے بعض شعبے قرآن کے تابع ہوں اور بعض شعبے ایسے نہ ہوں تو اسے بھی قرآنی حکومت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس لئے کہ نہ قرآن کے حصے بخرے کئے جا سکتے ہیں، نہ ہی نظام معاشرہ کے الگ الگ ٹکڑے۔ قرآن اس نظام میں داخل ہونے والوں سے کہتا ہے کہ اس میں داخل ہوتا ہے تو بالکلیہ (پورے کے پورے) داخل ہونا ہوگا۔ اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً۔ (۲/۲۰۸) (یہودیوں کی مثال پیش کر کے) تنبیہ کرتا ہے اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ کیا تم یہ روش اختیار کرنا چاہتے ہو کہ کتاب خداوندی کے ایک حصّہ پر ایمان لے آؤ اور دوسرے حصّے سے انکار کر دو۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵) تم میں سے جو بھی ایسی روش اختیار کرے گا، اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہوگا۔ اور آخرت میں شدید ترین عذاب میں مبتلا۔ خدا تو اس ضابطۂ حیات کے بعض حصوں سے انکار کرنے والوں کے متعلق یہ کہتا ہے اور یہاں یہ عالم ہے کہ حکومت کا کاروبار غیر قرآنی اور اس میں، آیاتِ قرآن کا مفہوم مسخ کر کے انہیں، خلافِ قرآن نظریات کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی قرآنی تائیدات کا خمیازہ ہم اس سے پہلے بری طرح بھگت چکے ہیں۔ ہمارے دورِ ملوکیت میں سرمایہ داری کا نظام رائج تھا تو قرآن کو مسخ کر کے اس کی ایسی تفسیریں مرتب کی گئیں۔ جن سے وہ قارونی نظام مطابقِ اسلام قرار پا جائے۔ اس سے اس امت ہی کو نہیں بلکہ عالمگیر انسانیت کو جس قدر نقصان پہنچا وہ ظاہر ہے۔ اب سوشلزم کا دور دورہ ہے تو قرآن کو اسی طرح مسخ کر کے اس کی تائید میں پیش کرنے کی کوششیں شروع ہو گئی ہیں۔ یہ دور بھی چلا جائے گا لیکن اس سے اسلام کو، مسلمانوں کو، اور عالمگیر انسانیت کو جس قدر نقصان پہنچے گا اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ قرآن کیساتھ اس قسم کا کھیل کھیلنا بہت بڑی جسارت ہے۔ اقبال کے الفاظ میں۔

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں۔
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

قرآن کے متعلق قرآن نازل کرنے والے نے کہا تھا کہ اس کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ اگر ہم سے قلب

---

[1] اگر کوئی حکومت اپنے ہاں قرآنی نظام رائج کرنا چاہے تو اسے کسطرح بتدریج اس پروگرام کو عمل میں لانا ہوگا اور موجودہ مسلمانوں کو کسطرح اس کے قالب میں ڈھالنا، یہ ایک جداگانہ بحث ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقعہ نہیں۔

کوہ میں نازل کر دیتے تو خشیت خداوندی سے وہ بھی تھرتھرا اٹھتا۔ (۵۹/۲۱) لیکن (وہ کہتا ہے کہ) بعض انسانی قلوب ہیں کہ وہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ پتھروں کی یہ کیفیت ہے کہ وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ .... (۲/۷۴) ان سے صاف اور شیریں پانی کے چشمے ابلنے لگ جاتے ہیں۔ لیکن انسانی قلوب سے چشمے ابلنا تو ایک طرف ان میں قرآن کی عظمت کے احساس سے ذرا سی لرزش بھی پیدا نہیں ہوتی ــــ اے کاش! ہم قرآن کی عظمت کو پہچان سکتے۔ اور اس کے بلند و بالا مقام کا احساس کر سکتے!

آخر میں حنیف صاحب قوم کو ایک ایسی نصیحت فرماتے ہیں جس میں دھمکی کا پہلو بھی مضمر ہے۔ ارشاد ہے:

> حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم نے اس سوشلزم کا اعتراف نہ کیا جس کی گنجائش اسلام نے اپنے اندر رکھی ہے تو ہمیں ردّ عمل کے طور پر اس بات کے لئے تیار رہنا چاہیئے کہ جلد ہی غریبوں کا ہاتھ امیروں کی گردن پر ہوگا۔ اور پھر سوشلزم نہیں" اس ملک میں کمیونزم آئیگا۔

اس سے پہلے یہ حضرات سوشلزم اور اسلامی سوشلزم کی اصطلاحات استعمال کرتے رہے اور قوم ان سے درخواست کرتی رہی کہ اتنا بتا دیجئے کہ ان دونوں میں فرق کیا ہے۔ لیکن انہوں نے اس کے جواب میں ایک لفظ تک کہنے کی جرأت نہیں۔ اقتدار کو لشترا اسی قسم کی ذہنیت پیدا کر دیا کرتا ہے[۱]۔ اب حنیف صاحب قوم سے کہتے ہیں کہ چپکے سے سوشلزم قبول کر لو ورنہ کمیونزم آ جائے گی اور یہ بتانے کی قطعاً ضرورت نہیں سمجھتے کہ ان دونوں میں فرق کیا ہے سوشلزم میں، الحاد و زندیقیت میں وہ کونسی کسر اور تشدد و استبداد میں وہ کونسی کمی رہ جاتی ہے۔ جسے پورا کرنے کے لئے کمیونزم آتی ہے: ہم نامحرم پروگیان راز، تو حنیف صاحب کی فہمائش سے اتنا ہی سمجھ سکے ہیں جیسے کسی مسلمان سے کہا جائے کہ چپکے سے مردار کھا جاؤ۔ ورنہ تمہیں لحم خنزیر کھانا پڑے گا! یا جیسے کوئی ڈاکو کسی راہرو سے کہے کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے، چپکے سے مجھے دیدو۔ ورنہ کوئی اور ڈاکو آ گیا تو وہ تم سے چھین کر لے جائے گا۔

---

[۱] اس کے برعکس کائنات کا واحد صاحب اقتدار، خدا ہے کہتا ہے کہ ہم کتاب (قانون) نازل کرتے ہیں، تو اس کے ساتھ ہی اس کی حکمت اور غایت بھی بتا اور سمجھا دیتے ہیں کہ ہم العزیز کے ساتھ الحکیم بھی ہیں۔

پیشگی خریدار توجہ فرمائیں!

سلسلہ معارف القرآن کی کتاب "برق طور" کے تازہ ایڈیشن کا اعلان طلوع اسلام میں چند ماہ سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ چونکہ بعض پیشگی خریداروں کے پاس اس کتاب کا پرانا ایڈیشن موجود ہوگا۔ اسلئے خصوصی درخواست آنے پر ہی انھیں تازہ ایڈیشن [جو مصنف کی نظر ثانی کے بعد شائع ہوا ہے] بھیجا جائے گا۔ یہی طریق ادارہ کی دیگر پرانی کتب کے تازہ ایڈیشنوں کے بارے میں آئندہ بھی اختیار کیا جائے گا۔

ناظم

نایاب کتابوں کے نئے ایڈیشن

پرویز صاحب کے سلسلۂ معارف القرآن کی ابتدائی کتابوں اور ادارہ طلوع اسلام کی کچھ اور کتب کے سابقہ ایڈیشن ختم ہو چکے تھے ان میں سے مندرجہ ذیل کے جدید ایڈیشن مصنف کی نظرثانی کے بعد پھر سے شائع ہو چکے ہیں۔

ابلیس و آدم یہ کتاب دین کے بنیادی تصورات پر مشتمل ہے۔ مثلاً انسان کی پیدائش اور کائنات میں اس کا مقام قصۂ آدم اور نظریۂ ارتقاء ملائکہ ابلیس، شیطان اور جنات کی حقیقت۔ وحی کی غرض و غایت، مقام نبوت و منصب رسالت جیسے موضوعات کی بصیرت افروز تشریح۔ قیمت:- مجلد گردپوش۔ پندرہ ۱۵/- روپے (علاوہ محصولڈاک)

جوئے نور یہ "ابلیس و آدم" کے سلسلے کی دوسری کتاب ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ تاریخ اور قرآن کا باہمی تعلق، اقوام سابقہ کی داستانوں کے بیان کا مقصد اور فلسفہ مارکس اور قرآنی نظریہ کا بنیادی فرق کیا ہے۔ ان تفصیلات کے بعد حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت شعیبؑ تک کے انبیاء کرام کے تذکار جلیلہ، سابقہ قوموں کی تباہی کے اسباب، عذاب خداوندی نظریۂ قومیت، ہجرت، معاشی نظام کی قرآنی تشریح۔ ایسے اہم موضوعات پر سیر حاصل بحث اور دلنشیں پیرایۂ بیان۔

قیمت:- مجلد گردپوش۔ پندرہ ۱۵/- روپے۔ (علاوہ محصولڈاک)

برق طور یہ "ابلیس و آدم" کے سلسلے کی تیسری کتاب ہے۔ یہ مشتمل ہے آویزش صاحب ضرب کلیم حضرت موسیٰؑ اور فرعون، اور بنی اسرائیل کی داستان عروج و زوال پر۔ اس میں ان کے واقعات ہی درج نہیں بلکہ اس ضمن میں نہایت اہم موضوع بھی سامنے آگئے ہیں۔ مثلاً عصائے موسیٰؑ۔ ید بیضا۔ ساحرین دربار فرعون کی کرشمہ سازیاں اور ان کی حقیقت سمندر کا پھٹنا اور چشموں کا پھوٹنا۔ من و سلویٰ عطا ہونا۔ حضرت موسیٰؑ کا ایک مرد بزرگ سے ملنا۔ ان تمام مباحث پر بڑی تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ اور داستان بنی اسرائیل کے سلسلہ میں قوموں کے عروج و زوال کے ابدی قوانین بھی سامنے آگئے ہیں۔ مصنف کی نظرثانی نے مضامین میں خاصا تنوع پیدا کر دیا ہے۔ قیمت:- مجلد گردپوش۔ پندرہ ۱۵/- روپے۔ (علاوہ محصولڈاک)

قرآنی فیصلے زندگی کے بیسیوں مسائل اور معاشرے کے معاملات کے متعلق قرآن کے احکام کیا ہیں؟ اور ہم کیا کرتے ہیں؟ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، صدقات، خیرات، قربانی، ترکہ وصیت۔ نکاح۔ طلاق۔ اوقاف۔ شراب۔ جوا۔ حرام و حلال یا مثلاً شب برات۔ عید میلاد۔ تصویر کشی۔ موسیقی۔ سینما۔ مشاعرے۔ عذاب قبر۔ نبی اکرمؐ و علم غیب۔ حضورؐ کا معراج۔ الہام۔ مرکز ملت۔ غلام اور لونڈیاں وغیرہ جن کے متعلق قرآن کے فیصلے کا آپ کو علم نہیں۔ ان کے بارے میں سب کچھ آپ کو ایک جگہ اس کتاب میں مل جائے گا۔

قیمت:- مکمل سیٹ تین جلد۔ پندرہ ۱۵/- روپے۔ فی جلد پانچ روپے (علاوہ محصولڈاک)

ملنے کا پتہ

مکتبہ دین و دانش، چوک اردو بازار۔ لاہور۔ ادارہ طلوع اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

مفسدین کا انجام

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

پرویز

[طلوعِ اسلام بابت جولائی ۷۳ء میں پرویز صاحب کا ایک مقالہ شائع ہو چکا ہے جس میں بتایا گیا ہے۔ کہ قرآن کریم کی رُو سے ظلم کا انجام کیا ہوتا ہے۔ زیرِ نظر مقالہ اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں واضح کیا گیا ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے فساد کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس وقت جبکہ ساری دنیا کی کیفیت وہ ہو چکی ہے جس کا نقشہ قرآن کریم نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (۳۰/۴۱) "لوگوں کے خود ساختہ نظام و اعمال کا نتیجہ یہ ہے کہ کرۂ ارض پر ہر جگہ فساد ہی فساد نظر آ رہا ہے" ان تنذیراتِ قرآنی کا بار بار سامنے لانا نہایت ضروری ہے، بالخصوص اپنی قوم کے سامنے جو قرآن کریم پر ایمان رکھنے کی مدعی ہے۔ طلوعِ اسلام]

اصلاح اور فساد" قرآن کریم کی دو اہم اصطلاحات ہیں اور ایک دوسرے کی ضد۔ ہمارے ہاں، فساد کا لفظ، دنگہ فساد یا لڑائی جھگڑے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور "صلح" کا لفظ "صلح صفائی" کے لئے، اور اصلاح، ریفارم کے معنوں میں۔ لیکن (عربی زبان اور) قرآن کریم میں یہ اصطلاحات، ان سے کہیں زیادہ وسیع معانی میں استعمال ہوئی ہیں۔ صلح کے بنیادی معنی ہوتے ہیں "جس چیز کو جس حال میں ہونا چاہیئے، اُسے ٹھیک ٹھیک اسی حال میں ہونا۔" چنانچہ معاشرہ کی ناہمواریاں دور ہو جانے اور افراد کی صلاحیتوں کے مناسب نشو ونما پا لینے کے لئے بھی یہی الفاظ آتے ہیں۔ اعمالِ صالحہ، ان کاموں کو کہتے ہیں جن سے حسنِ کائنات میں نکھار پیدا ہو، جن سے معاشرہ کے بگڑے ہوئے کام سنور جائیں۔ اور انسانی ذات کی صلاحیتوں کی نشو ونما ہو جائے۔ فساد اس کی ضد ہے جس کے معنی ہیں، بگاڑ پیدا ہونا۔ توازن بگڑنا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کے پرکھنے کا معیار کیا ہے کہ ایک چیز کو جس حالت میں ہونا چاہیئے وہ اس حالت میں ہے یا نہیں۔ طبیعی اشیاء (PHYSICAL THINGS) کے متعلق یہ معلوم (بلکہ طے) کرنا آسان ہے۔ کہ جس شے کو جس حالت میں ہونا چاہیئے وہ اس حالت میں ہے یا نہیں۔ معمل (یعنی لیبارٹری) کا ٹسٹ، اس کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ لیکن انسانوں کی اخلاقی اور تمدنی دنیا میں اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا

ہے۔ اس دنیا میں کوئی مفسد، اس کا اقرار و اعتراف نہیں کرتا کہ وہ فساد پیدا کر رہا ہے۔ اس کا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ وہ مصلح (اصلاح کرنے والا) ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ

وَ إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ ۙ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ (2/11)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ملک میں فساد مت برپا کرو تو یہ کہتے ہیں کہ (ہم فساد کب برپا کرتے ہیں) ہم تو مصلح ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص بدنیتی سے فساد کو اصلاح سے تعبیر نہ کرتا ہو بلکہ نہایت نیک نیتی سے فساد کو اصلاح سمجھ کر اس کے لئے کوشاں ہو۔ لیکن نتیجہ بہرحال دونوں صورتوں میں ایک ہی مرتب ہوگا ــــ لہٰذا اس چیز کو لوگوں کے انفرادی فیصلے پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس کے لئے کوئی خارجی معیار (OBJECTIVE STANDARD) ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے حسبِ معمول ہماری توجہ خارجی کائنات کے نظم و نسق کی طرف مبذول کرائی ہے اور کہا ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ کارگہِ کائنات کس طرح ٹھیک ٹھیک چل رہا ہے۔ اس میں ہر شے ویسی ہی ہوتی ہے جیسی اُسے ہونا چاہیئے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ آج بارش کے پانی کے اجزاء کچھ اور ہوں اور کل وہ کچھ اور ہو جائیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ جَو کے بیج سے گندم پیدا ہو جائے اور گندم کے بیج سے جَو ــــ سورج کبھی کہیں سے طلوع ہونا شروع ہو جائے اور کبھی کہیں سے، چاندنی کا رنگ آج کچھ اور ہو اور کل کچھ اور، کبھی خزاں میں پھول کھلنے لگ جائیں اور بہار میں مرجھا جائیں ــــ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ

(۱) ــــ کائنات میں ۔۔۔ صرف ایک خدا کا قانون نافذ العمل ہے، کسی اور کا نہیں ــــ اس لئے یکساں حالات میں ہر عمل کا نتیجہ بھی ایک جیسا مرتب ہوتا ہے۔ اسے سائنس کی اصطلاح میں (LAW OF UNIFORMITY OF NATURE) کہتے ہیں ــــ اور

(۲) ہر شے اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے جو اس کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ وہ قانون کو اپنی مرضی کے تابع نہیں رکھتی۔

اوّل الذکر کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا (21/22)

اگر ارض و سما (کائنات) میں خدا کے علاوہ کوئی اور صاحبِ اقتدار بھی ہوتا، تو اس میں فساد برپا ہو جاتا۔

اور ثانی الذکر کے سلسلہ میں کہا کہ

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ (23/71)

اگر حق (خدا کا قانون محکم) لوگوں کی مرضی کے تابع ہو جائے، تو ساری کائنات میں فساد برپا ہو جائے۔

یعنی فساد (بگاڑ) سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ (۱) قانون ایسا ہو جو کسی کی خواہش، مرضی، آرزو

یا مفاد کے تابع نہ ہو ــــ اور (۲) ہر ایک اس قانون کا اتباع کرے۔ خارجی کائنات کا نظام اسی پروگرام کے مطابق چل رہا ہے۔ اس میں جو قانون کارفرما ہے وہ نہ تو اشیائے کائنات کا اپنا پیدا کردہ ہے اور نہ ہی کسی کی خواہش کے مطابق اس میں تبدیلی ہو سکتی ہے اور دوسرے یہ کہ ہر شے اس قانون کے مطابق چلنے پر مجبور ہے ــــ وَ (هُمْ) لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ۔ (۱۶/۵۰)

جہاں تک انسانوں کی تمدنی دنیا کا تعلق ہے، اس کے لئے بھی اُسی خدا نے قوانین مقرر کر دیئے ہیں۔ جس نے اشیائے کائنات کے لئے قوانین مرتب کئے ہیں۔ لیکن انسان اور دیگر اشیائے کائنات میں ایک بنیادی فرق ہے (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) اشیائے کائنات، متعلقہ قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور پیدا کی گئی ہیں، لیکن انسان کو اس باب میں صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا گیا ہے۔ مشیت چاہتی یہ ہے کہ جو کچھ اشیائے کائنات مجبوراً کرتی ہیں، انسان وہی کچھ (یعنے قوانین خداوندی کا اتباع) اپنے اختیار و ارادے سے کرے، کہ اسی سے اس کی ذات کی نشوونما اور شرفِ انسانیت کی بالیدگی ہوتی ہے۔

لیکن انسان اپنے اختیار و ارادے کا استعمال غلط کرتا ہے اور اسی سے وہ تمام فساد پیدا ہوتا ہے، جو اس کی زندگی کو جہنم بنا دیتا ہے۔ یہ اپنے لئے آپ قوانین وضع کرتا ہے اور پھر تماشا یہ کہ ان قوانین کا بھی کماحقہٗ اتباع نہیں کرتا۔ ان سے بچنے کے لئے گریز کی ہزار راہیں نکالتا اور لاکھ حیلے تراشتا ہے ــــ انسان کی یہی وہ ذہنیت (اور روش) ہے، جسے قرآن کریم نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بایں حسن و خوبی بیان کیا ہے۔ ملائکہ اس جدید مخلوق کے ہیولائے آب و گل کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ (۲/۳۰) اسے بااختیار بنایا جا رہا ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ زمین میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا ــــ کہا کہ ٹھیک ہے۔ اگر اسے اصلی حالہ چھوڑ دیا گیا تو یہ ایسا ہی کرے گا۔ لیکن ہم اسے خود قوانین زندگی دیں گے ــــ (فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى) یہ اگر ان قوانین کا اتباع کرے گا تو پھر یہ حالت نہیں ہو گی ــــ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (۲/۳۸) جو ان قوانین کا اتباع کرے گا تو ایسے لوگوں کو نہ خوف ہو گا نہ حزن، ان کی تمدنی زندگی فساد انگیزیوں سے، ماموں اور خون ریزیوں سے مصئون رہے گی۔ اس کا نام اصلاح ہے۔ اور اس کی خلاف ورزی کا نتیجہ فساد ــــ اسی لئے تاکید کی گئی کہ ــــ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ــــ جب تمہاری تمدنی زندگی بہ حالتِ اصلاح ہو تو اس میں فساد مت پیدا کرو۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ۔ وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا (۷/۵۶) ــ دفعِ مضرت مقصود ہو، یا جلبِ منفعت (کسی کے نقصان سے بچنا چاہو، یا کوئی فائدہ حاصل کرنا ــ دونوں صورتوں میں) قانونِ خداوندی کو آواز دیا کرو، اور اس کے مطابق قدم اٹھایا کرو۔ تمہاری زندگی فساد سے محفوظ ہو جائے گی۔ اس کے برعکس اگر تم نے اس اصولِ حیات سے انکار کیا اور اس سے سرکشی برتی ــــ خود بھی سرکشی برتی اور دوسروں کو بھی اس راستے پر چلنے سے روکا، تو اس سے اس قسم کا فساد پیدا ہو جائے گا جس کی تباہیاں بڑھتی چلی جائیں گی۔ (۱۶/۸۸)

ان اصولی ہدایات کے بعد قرآن کریم نے محسوس انداز میں بتایا کہ انسانوں کی تمدنی زندگی میں فساد کس کس شکل میں رونما ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اس نے فسادِ ملوکیت کو نمایاں طور پر پیش کیا جس کی نمائندگی دنیا کا ہر فرعون کرتا ہے۔ ملوکیت سے مراد ہے ایسا نظامِ مملکت جس میں انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کی جائے (خواہ اس کی عملی شکل ــــ جلالی بادشاہی ہو، یا جمہوری تماشا)۔ سفادِ ملوکیت کا پہلا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسانی وحدت کو ختم کر کے، انہیں مختلف گروہوں میں بانٹ دیا جائے ــــ وَيُقَطِّعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۲۵) جس انسانی برادری کو ملا کر رکھنے کا حکم خدا نے دیا تھا وہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور اس طرح زمین میں فساد بپا کر دیتے ہیں ــــ اس کی بدترین شکل، عصرِ حاضر کی قومیت پرستی (نیشنلزم) ہے جس نے (بعض نقشوں پر کھینچی ہوئی فرضی اور غیر فطری لکیروں کے مطابق) عالمگیر انسانیت کو اس طرح مختلف گروہوں میں بانٹ رکھا ہے۔ کہ ایک گروہ، دوسرے گروہ کے خون کا پیاسا، اور ایک قوم دوسری قوم کی جان کی دشمن بن رہی ہے۔ اس سے اگلا قدم، ایک قوم کے اندر مختلف پارٹیاں بنانا ہے۔ قرآن کریم نے فرعون کے خلاف جو سب سے بڑا جرم عائد کیا ہے، وہ یہی ہے کہ وہ قوم (بنی اسرائیل) کو پارٹیوں میں تقسیم کرتا رہتا تھا ــــ إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ ــــ فرعون نے ملک میں بڑی سرکشی اختیار کر رکھی تھی ــــ اس نے اُدھم مچا رکھا تھا۔ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا۔ یعنی اس نے ملک کے باشندوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا ــــ اس پارٹی بازی سے اس کا مقصد کیا تھا؟ یہ کہ وَيَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِنْهُمْ ــــ وہ اس طرح اس گروہ کو جس سے اسے ذرا خطرہ محسوس ہوتا تھا، کمزور کر دیتا تھا۔ اس کی عملی شکل یہ تھی کہ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ۔ اس پارٹی کے ان افراد کو جن میں جوہرِ مردانگی کی نمود ہوتی، ذلیل و خوار کر دیتا اور عورتوں کو آگے بڑھاتا چلا جاتا۔ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ (۲۸/۴) ــــ یہ تھی اس کی فساد انگیزی جس سے اس نے معاشرہ میں اسقدر ناہمواریاں پیدا کر رکھیں تھیں۔

اور یہ چیز کسی خاص فرعونی حاکم کے ساتھ مخصوص نہیں تھی، یہ ملوکانہ حکمتِ عملی ہے، جو ہر زمانے میں اسی طرح کارفرما رہتی ہے۔ چنانچہ سورہ نمل میں، اس حقیقت کو (ملکہ سبا کی زبانی) ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ

إِنَّ الْمُلُوكَ[1] إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً۔ وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ۔ (۲۷/۳۴)

یاد رکھو! جب بادشاہ کسی ملک پر چڑھائی کرتے ہیں تو اُسے اُلٹ پلٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ یعنی وہاں کے صاحبِ عزت اکابرین کو سب سے زیادہ ذلیل و خوار بنا دیتے ہیں اور یہ بات

---

[1] آ بتاؤں تجھ کو شرح آیۂ إِنَّ الْمُلُوكَ
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادو گری! (اقبال)

کسی خاص بادشاہ سے متعلق نہیں، ملوکیت میں یہی کچھ ہوتا چلا آیا ہے اور یہی کچھ ہوتا رہے گا۔

ملوکیت کی ہستی کا راز ہی اس میں ہے کہ قوم مختلف پارٹیوں میں بٹی رہے اور اس میں ایسا اتار چڑھاؤ ہوتا رہے کہ کبھی ایک گروہ اوپر آجائے اور کبھی دوسرا ـــ اور اس عمل دولابی میں نکتہ پیشِ نظر یہ ہے کہ جس فرد یا گروہ میں کہیں جوہر انسانیت کے آثار محسوس ہوں، اسے کچل کر رکھ دیا جائے اور اپنے گرد و پیش انہیں رکھا جائے جن میں ابھرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو۔ یہ تھی فسادِ آدمیت کی وہ اوّلین لعنت جسے مٹانے کے لئے آسمانی انقلاب کے داعی (حضرت انبیاء کرامؑ) دنیا میں آتے رہے ـــ اور یہی تھی ان کی وہ انقلابی دعوت جسے ملوکیت کے علمبردار "فساد" سے تعبیر کر کے کچل دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب صاحبِ ضربِ کلیم، حضرت موسیٰؑ نے اس حکمتِ فرعونی کے خلاف آواز بلند کی تو فرعون کے درباریوں نے اس سے کہا کہ ـــ اَتَذَرُ مُوسٰی وَ قَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ - (۷/۱۲۷) "کیا تو موسیٰؑ اور اس کی قوم کو اس طرح آزاد چھوڑ دینا چاہتا ہے کہ وہ ملک میں فساد برپا کر دیں"۔

آپ نے غور فرمایا کہ ملوکیت کے نمائندگان کے نزدیک "اصلاح" کا تصور کیا ہوتا ہے اور "فساد" سے مراد کیا؟ ہر مستبد قوت، معاشرہ میں صحیح اصلاح کو فساد سے تعبیر کر کے، اس کے داعیان کو حوالہ دار و رسن کر دینا چاہتی ہے۔ یہ ارباب اقتدار کا گروہ ہوتا ہے، جسے اس قسم کے صحیح انقلاب میں، اپنی مفاد پرستیوں کی موت نظر آتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ جب حضرت صالحؑ نے، قوم ثمود کی فساد انگیزیوں کے خلاف، (جن کی تفصیل ذرا آگے چل کر آئے گی)، اعلانِ احتجاج کیا تو اس قوم کے اربابِ اقتدار کو خطرہ محسوس ہوا۔ ان کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی۔

وَ كَانَ فِى الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (۲۷/۴۸)

دارالسلطنت میں صرف نو بڑے بڑے سردار تھے، جن کے ہاتھ میں زمام اقتدار تھی۔ وہی ان تمام شرارتوں کی جڑ تھے۔ وہ ملک میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے تھے اور قوم کو کبھی اصلاح کی طرف نہیں آنے دیتے تھے۔

چنانچہ

انہوں نے اپنی میٹنگ بلائی اور آپس میں کہا کہ قسم اٹھاؤ کہ ہم سب مل کر صالحؑ اور اس کے ساتھیوں پر رات کے وقت حملہ کریں گے اور پھر ان کے ورثاء کے سامنے صاف مکر جائیں گے اور کہہ دیں گے کہ ہم نے انہیں قتل ہوتے دیکھا تک نہیں اور ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔ (۲۷/۴۹)

یہ تھی فسادِ آدمیت کی پہلی شکل ـــ یعنی بساطِ ملوکیت کی مہرہ بازیاں ـــ اسکی دوسری شکل معاشی ناہمواریاں ہیں جن کا ذکر قرآن کریم نے بڑی شرح و بسط سے کیا ہے۔ اس نے قصۂ آدم کے (تمثیلی انداز) میں، اس "جنت کی زندگی" کے متعلق (جس میں ہنوز فساد پیدا نہیں ہوا تھا)، کہا کہ اس میں کیفیت یہ تھی کہ وَ كُلَا مِنْهَا

رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا۔ (۲/۳۵)۔۔۔ ہر ایک کو، ہر جگہ، سیر ہو کر کھانے کو ملتا تھا۔۔۔ اس میں کسی فرد کو، نہ بھوک کا خوف ستاتا تھا، نہ پیاس کا۔۔۔ نہ لباس کی محتاجی تھی نہ مکان کی" (۲۰/۱۱۸-۱۱۹)۔۔۔ یہ تھی معاشرہ کی وہ حالت جسے فساد نے نہیں چھوا تھا۔ اس کے بعد حقیقت فراموش انسان کی مفاد پرستی نے اس میں فساد پیدا کر دیا تو معاشرہ کی یہ حالت باقی نہ رہی۔ مصلحین انسانیت، حضرات انبیاء کرامؑ آتے رہے، تاکہ معاشرہ کو پھر سے انہی خطوط پر متشکل کریں۔ وہ قوم سے کہتے یہ تھے کہ۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ (۲/۶۰)

خدا نے جس قدر سامانِ زیست عطا کیا ہے، اس میں سے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق کھاؤ پیو۔ اور زمین میں فساد مت برپا کرو۔۔۔ معاشرہ میں ناہمواریاں نہ پیدا کرو۔

قرآن کریم نے جن اقوام کی سرگزشت بیان کی ہے، ان میں سے "قوم ثمود" نے اسی قسم کی معاشی ناہمواریاں شدید طور پر پیدا کر لی تھیں۔ اس زمانے کی معیشت، گلہ بانی پر مبنی تھی۔ قوم کے ذی قوت طبقہ نے "ملک کی چراگاہوں اور چشموں پر اس طرح قبضہ کر رکھا تھا کہ کمزوروں اور غریبوں کے مویشیوں کو نہ کھانے کو چارہ ملتا تھا، نہ پینے کو پانی۔۔۔

حضرت صالحؑ اس "فساد" میں "اصلاح" پیدا کرنے کے لئے اٹھے۔ انہوں نے ان مستبد سرداروں سے کہا کہ۔۔۔ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ۔ (۷/۷۴)۔۔۔ خدا نے تمہیں جن نعماء سے نوازا ہے، انہیں پیش نظر رکھو۔ اور ملک میں فساد برپا نہ کرو۔۔۔ معاشی ہمواریاں پیدا کرو۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تمام مویشیوں کی باری باندھ لو۔۔۔ خواہ وہ غریبوں کے مویشی ہوں، اور خواہ امیروں کے، رزق کی ضرورت تو ہر مویشی کو ہوتی ہے۔ ان کی ضروریات پورا ہونے دو۔

قوم مدین کا معاشی نظام، کاروباری تھا۔ اور انہوں نے اس میں بھی فساد پیدا کر رکھا تھا۔ اس فساد کی تشریح، حضرت شعیبؑ کے الفاظ میں یوں بیان ہوئی ہے۔ انہوں نے قوم سے کہا کہ

فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا۔ (۷/۸۵)

(تمہیں چاہیئے، کہ اپنے معاشی نظام میں عدل سے کام لو) ماپ تول کو پورا رکھو۔ لوگوں کے حقوق و واجبات میں کمی نہ کرو۔ اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہو جانے کے بعد، ناہمواریاں مت پیدا کرو۔

قرآن کریم نے مختلف مقامات پر، قوم مدین کی اس فساد انگیزی کا ذکر کیا ہے اور ہر مقام پر اسے انہی الفاظ سے تعبیر کیا ہے (مثلاً ۱۱/۸۵، ۲۶/۱۸۱-۱۸۳)۔۔۔ "ماپ تول پورا رکھنے" سے مراد اتنا ہی نہیں کہ ترازو اور باٹ صحیح رکھو۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ اپنے معاشی نظام کو عدل کی بنیادوں پر استوار کرو۔

معاشی فساد کی بنیاد، سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے۔ قرآن کریم نے قارون کو اس ذہنیت کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سورۂ قصص میں اس کی "فساد انگیزی" کی تفصیل ان الفاظ میں آئی ہے۔

قارون، قوم موسیٰؑ ہی کا ایک فرد تھا، کوئی غیر نہیں تھا۔ لیکن اپنی دولت کے بل بوتے پر اپنی قوم کے افراد سے بڑی زیادتی کرتا تھا۔ چنانچہ اس طرح اس کے پاس اس قدر دولت جمع ہو گئی، کہ اس کے خزانے کی حفاظت

کے لئے ایک طاقتور جماعت کی ضرورت تھی۔ اس دولت کے نشہ نے اُسے مدہوش کر دیا تھا چنانچہ اس کی قوم کے ہوشمند طبقہ نے اس سے کہا کہ تم اس مال و دولت پہ اس قدر اتراؤ نہیں' اس کا نتیجہ خراب ہوگا۔ یہ روش' قانونِ خداوندی کی رُو سے پسندیدہ نہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ تم مال و دولت کو تیاگ کر تارک الدنیا بن جاؤ۔ ہرگز نہیں۔ ہم کہتے یہ ہیں کہ تم اس سے بھی فائدہ اٹھاؤ۔ لیکن اس حقیقت کو فراموش مت کرو کہ زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی نہیں جس میں انسان کا منتہائے نگاہ مال و دولت جمع کرنا ہے اور بس زندگی اس سے آگے بھی چلتی ہے۔ اس مال و دولت سے تم اس زندگی کو بھی خوشگوار بنا ؤ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح خدا نے تمہاری ہر کمی کو پورا کر کے تمہاری زندگی کو حسین بنا دیا ہے' اسی طرح تم دوسروں کی کمی کو پورا کر کے ان کی زندگی کو بھی حسین بنا دو۔ اور معاشرہ میں فساد (ناہمواریاں) مت پیدا کرو (کہ تم امیر سے امیر تر ہوتے جاؤ اور دوسرے لوگ غریب سے غریب تر ہوتے جائیں۔ اسی کو فساد کہتے ہیں) اور فساد پیدا کرنے والوں کو خدا کبھی پسند نہیں کرتا۔

یہ سن کر اس نے ان سے کہا کہ تمہیں میرے معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔ یہ دولت میں نے اپنی ہنرمندی اور چابک دستی سے کمائی ہے' اس لئے اسے جس طرح میرا جی چاہے' صرف کروں۔ اس میں خدا کا کیا دخل ہے اور کسی کو مجھ سے بازپرس کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟

اسے کاش! اُسے معلوم ہوتا کہ اس قسم کی ذہنیت نے اس سے پہلے کتنی قوموں کو تباہ کر دیا تھا جو اس سے زیادہ قوت و حشمت کی مالک تھیں' اور انہوں نے مال و دولت بھی اس سے کہیں زیادہ جمع کر رکھا تھا۔ خدا کے قانونِ مکافات نے انہیں تباہ کر دیا۔ ان کے یہ جرائم اس قدر بدیہی اور نمایاں تھے کہ اس کی بھی ضرورت نہ پڑی کہ ان کے متعلق کچھ پوچھ گچھ کی جائے۔ (نظامِ سرمایہ داری کی تو بنیاد میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی تباہی کہیں خارج سے نہیں آیا کرتی۔) (مفہوم القرآن $\frac{۲۸}{۷۶-۷۷}$)

اور فساد کا یہی تباہ کن انجام ہے جس کی طرف قرآن کریم نے بار بار توجہ دلائی ہے — کہیں عمومی حیثیت سے اور کہیں فساد انگیز قوموں کی تباہی کا خصوصی ذکر کر کے — عمومی طور پر کہا کہ

اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۔ زِدۡنٰہُمۡ عَذَابًا فَوۡقَ الۡعَذَابِ بِمَا کَانُوۡا یُفۡسِدُوۡنَ ۔ ($\frac{۱۶}{۸۸}$)

جو لوگ اس صداقت سے خود بھی انکار کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی اس طرف آنے نہیں دیتے' ان کی تباہیاں دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ اس فساد کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ جسے وہ معاشرہ میں برپا کرتے ہیں۔

سورہ بقرہ میں' اس روش کے حاملین کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ — اُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ۔ ($\frac{۲}{۲۷}$) ان لوگوں کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ سورہ یونس میں کہا کہ — اِنَّ اللّٰہَ لَا یُصۡلِحُ عَمَلَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ($\frac{۱۰}{۸۱}$)۔ یہ یقینی بات ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے' ایسا ہو نہیں سکتا کہ معاشرہ میں فساد پیدا کرنے والوں کے کام سنور جائیں۔ یعنی معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہو جائے اور جو لوگ اس بگاڑ کے ذمہ دار ہوں' ان کی حالت سنور تی جائے' یہ ناممکن ہے۔ حالت انہی کی سنورے گی جو معاشرہ کو

سنوارنے کی کوشش کریں گے۔ سورۂ حٰمٓ میں ہے۔

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ... (۳۸/۲۸)

کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ جو قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں، اور معاشرہ کو سنوارنے والے کام کریں، وہ اور وہ لوگ جو معاشرہ میں فساد پیدا کریں، دونوں برابر ہو جائیں؟ ایسا ہو نہیں سکتا۔

اس اصولِ محکم کی تبیین کے لئے اس نے کہا کہ تاریخ کے اوراق پر غور کرو اور دیکھو کہ جن اقوام نے اس قسم کی روش اختیار کی تھی، ان کا انجام کیا ہوا؟ ــــ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ۔ (۷/۸۶) عاد اور ثمود اور فرعون (وغیرہ) نے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کیں ــــ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ۔ (۸۹/۱۳) تو خدا کے قانونِ مکافات نے انہیں بُری طرح سے تباہ کر دیا۔

یہ تباہی اس وقت آتی ہے جب معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنے کی روش عام ہو جائے اور جو لوگ اس پوزیشن میں ہوں کہ اس غلط روش کا سدِباب کر سکیں وہ بھی لوگوں کو اس سے روکنے کی کوشش نہ کریں ــــ چنانچہ اقوامِ سابقہ کی سرگذشت بیان کرنے کے بعد، قرآن کریم نے کہا کہ ان اقوام میں سے

جو لوگ تباہی سے بچ جاتے تھے، ان میں سے بھی بعد میں، معدودے چند ایسے رہ جاتے جو اپنے مفاد کو خدا کے قانون کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور ملک میں لوگوں کو ناہمواریاں پیدا کرنے سے روکتے، ورنہ باقیوں کا حال تو یہ ہو جاتا کہ وہ قوانینِ خداوندی سے سرکشی برت کر اپنی اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگے رہتے اور دوسروں کا سب کچھ لوٹ کھسوٹ کر لے جاتے، تاکہ ان کی آسودگیوں اور تن آسانیوں میں فرق نہ آنے پائے (خواہ باقی مخلوق پر کچھ ہی کیوں نہ گذرے)، یہ تھے ان کے جرائم جن کی وجہ سے ان پر تباہی آتی تھی۔ (مفہوم القرآن۔ ۱۱۶)

آپ قرآن کریم کے ان مقامات پر غور کریں اور پھر سوچیں کہ اس نے فسادِ آدمیت کی جو جو شقیں بتائی ہیں، کیا وہ ہمارے معاشرے میں جمع نہیں ہو رہیں؟ اور اگر یہ حقیقت ہے تو کیا اس انداز معاشرت کا حتمی اور یقینی نتیجہ وہی نہیں ہوگا۔ جو اقوامِ سابقہ کے ہاں ہوا تھا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری حالت اس وقت بعینہٖ ویسی ہی ہو چکی ہے جیسی قومِ مدین کی تھی۔ اس قوم کے متعلق جو کچھ قرآن کریم نے کہا ہے وہ ہر قلبِ حساس کے لئے سامانِ صد ہزار عبرت اپنے اندر رکھتا ہے۔ سورہ ھود میں ہے۔

اور اسی طرح ہم نے قومِ مدین کی طرف، ان کے بھائی بند، شعیبؑ کو بھیجا۔ اس نے ان سے کہا کہ تم (اپنے آئین و رسوم کو چھوڑ کر) صرف خدا کے قوانین کی اطاعت اختیار کر لو۔ اس کے سوا تمہارے لئے تو کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت تو تم بڑے خوش حال ہو، لیکن تم نے اپنے معاشرہ میں سخت ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اس حالت کو بدلو۔ اپنے ناپ تول کے پیمانوں کو پورا رکھو۔ ہر ایک کو اس کا پورا پورا حق دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو مجھے خطرہ ہے کہ تم پر ایسی تباہی آ جائے گی جو تم سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیگی

بقیہ صفحہ پر

نمائندہ چٹان کا پرویز صاحب سے انٹرویو

پرویز صاحب نے ان سوالات کے جواب تحریر کئے دیئے تھے جنہیں ہم
بمسرت درج ذیل کرتے ہیں — (طلوعِ اسلام)

سوال ۱

(۱) اس وقت آپ کے نزدیک پاکستان اور اس قوم کا اہم ترین مسئلہ کیا ہے یعنی ایسا مسئلہ جو پاکستان کے لئے بقا اور استحکام کی خصوصیت رکھتا ہے۔ پھر ہم اس مسئلہ کے مثبت نتائج کیونکر حاصل کر سکتے ہیں۔

(ب) کیا اسلام حال یا مستقبل کے لئے ایک فعال قوت (LIVING FORCE) کی خصوصیت رکھتا ہے؟ جواب اثبات میں ہے تو اس خصوصیت کی بنیادیں کیا ہیں۔

جواب

ہم پاکستان میں ابھی تک ایک قوم (قرآن کریم کی اصطلاح میں اُمّتِ واحدہ) نہیں بن سکے۔ ہم یا تو انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں اور یا زمانہ قبل از اسلام کی قبائلی زندگی۔ انفرادی زندگی میں اجتماعی مفاد کا تصور تک نہیں ہوتا اور قبائلی زندگی کا لازمی نتیجہ باہمی مخالفتیں، مخاصمتیں، عداوتیں، تصادمات، فسادات اور خونریزیاں ہوتا ہے۔ میرے نزدیک پہلا بنیادی اور سب سے اہم مسئلہ ان منتشر افراد اور متصادم گروہوں کو ایک قوم (اُمّتِ واحدہ) کے قالب میں ڈھالنا ہے۔

مغرب نے قومیت کا معیار وطن کا اشتراک قرار دیا تھا اور اسی معیار کے مطابق ہندوستان میں متحدہ قومیت کا تصور اُبھرا تھا۔ قرآن کریم نے قومیت (تشکیلِ اُمّت) کا معیار ایمان کا اشتراک قرار دیا۔ اس معیار کی رو سے ساری دنیا کے انسان دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں — ایک گروہ اُن افراد کا جو ایمان میں مشترک ہوں اور دوسرا اُن کا جن کا ان کے ساتھ ایمانی اشتراک نہ ہو۔ بالفاظِ دیگر، قرآن کی رو سے دنیا میں دو ہی قومیں رہ جاتی ہیں — مسلم اور غیر مسلم — اسی کو "دو قومی نظریہ" کہا جاتا ہے، اس نظریہ کی بنیادوں پر ہم نے پاکستان کا مطالبہ، اور پھر اس مملکت کو حاصل کیا تھا۔ لیکن حصولِ پاکستان کے بعد ہم نے خود ہی اس نظریہ کو خیرباد کہہ دیا، یعنی ہم نے پاکستان کی جغرافیائی حدود میں بسنے والے تمام لوگوں، مسلمانوں اور غیر مسلموں — کو ایک قوم قرار دے دیا۔ اگر ہم کھلے بندوں اس کا اقرار اور اعلان کر دیتے کہ ہمارا معیارِ قومیت اب وطن کا اشتراک ہے نہ کہ ایمان کا تو ہم اپنے خیال پر

قوم کی تشکیل کر لیتے۔ لیکن ہم نے کیا یہ کہ عملاً مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک قوم قرار دے دیا لیکن زبانی دو قومی نظریہ کے الفاظ دہراتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ ہم ایمان کے اشتراک کی بنا پر مسلمانوں کو ایک قوم (اُمّتِ واحدہ) بنا سکے اور نہ ہی وطنیت کی بنیادوں پر ایک قوم متشکل کر سکے۔ قرآن کریم کی رُو سے "تذبذب اور منافقت کا فطری نتیجہ" حبطِ اعمال اور تخریب آل ہوتا ہے یہی ہمارے ساتھ ہوا۔ جب تک ہم اس باب میں ذہنی اور قلبی طور پر یکسو نہیں ہوتے ہم ایک قوم نہیں بن سکتے۔ اگر ہم وطنیت کی بنیادوں پر ایک قوم بننا چاہتے ہیں تو ہرچند یہ روش اسلام کے خلاف ہو گی، لیکن اس سے کم از کم مغربی انداز کی ایک قوم تو متشکل ہو جائے گی۔ اور اگر ہم اسلام سے وابستہ رہنا چاہتے ہیں تو پھر دو قومی نظریہ کو دیانتداری سے عملاً نافذ کرنا ہوگا۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، اس نظریہ کے دو گوشے ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی غیر مسلم مسلم قوم کا فرد قرار نہیں پا سکتا، اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے اندر نسلی، لسانی، وطنی، ثقافتی، سیاسی، مذہبی، غرضیکہ کسی میلان و رجحان کے تابع تفرقہ پیدا کرنا اسلام سے برگشتگی اور مملکت کے خلاف بغاوت کی دلیل ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے اُمّت کی وحدت باقی نہیں رہتی جو توحید کا لازمی نتیجہ ہے۔ قرآن کریم بہ نصِ صریح اُمّت میں تفرقہ کو شرک قرار دیتا ہے۔ اس مقصد کے لئے موجودہ مسلمانوں کو، کہ جن کی تعلیم و تربیت اسلام کی رُو سے نہیں ہوئی، بہرحال از روئے قانون ایک قوم بنانا ہوگا۔ یہ طریق کار ہنگامی اور عارضی ہوگا، مستقل اور پائیدار طریقِ عمل یہ ہوگا کہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کریں کہ ایمان کے اشتراک کی رُو سے وحدتِ اُمّت، اُن کے قلب کی آواز اور روح کی پکار بن کر ابھرے۔ میں شروع ہی سے دو قومی نظریہ کا مبلغ اور نظام تعلیم میں اس قسم کی تبدیلی کا داعی چلا آ رہا ہوں۔ میرے نزدیک اس مسئلہ کا اس کے سوا کوئی حل نہیں۔

(ب) اسلام ان ابدی اقدارِ خداوندی اور اصولِ سماوی سے عبارت ہے جو زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں، اس لئے یہ دین (نظامِ حیات) ہر زمانے کے لئے فعال قوت ہے۔ طلوع اسلام کی سالقہ سالانہ کنونشن میں میرے ایک خطاب کا عنوان تھا۔ "کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے" — اس کا جواب نفی میں دیتے ہوئے میں نے مدلل و شواہد بتایا تھا کہ قرآن کے پیش کردہ اصولِ زندگی اور نظریاتِ حیات کس طرح عالم انسانیت کو متاثر کئے چلے آ رہے ہیں۔ اور انسانی ذہن کس طرح انہیں غیر شعوری طور پر قبول کئے جا رہا ہے۔ قرآن کا نصب العین ان اقدار کی رُو سے عالم بشریت کو ایک عالمگیر برادری میں متشکل کرنا ہے۔ ان اقدار میں احترامِ آدمیت اور مساواتِ انسانیہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اقوامِ عالم اپنی انفرادی مفاد پرستیوں اور گروہ مندانہ مصلحت اندیشیوں کے تباہ کن نتائج سے اب اسقدر تنگ آ چکی ہیں کہ وہ اپنی خود پیدا کردہ تفریقات کو مٹا کر ایک عالمگیر برادری کی تشکیل کے لئے ترس اور تڑپ رہی ہیں لیکن اس کے لئے انہیں کوئی اساس نہیں مل رہی۔ قرآن وہ اساسِ محکم پیش کرتا ہے جو کبھی متزلزل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ مفکرین عالم اب رفتہ رفتہ اسی نہج پر سوچ رہے ہیں۔

سوال ۲

ہم اسلام کو ماضی کے گرد و غبار سے، جو ملوکیت، ملائیت اور تصوف سے پیدا ہوا ہے، کیونکر نکال سکتے ہیں؟

جواب

اللہ تعالیٰ نے حق و باطل اور غلط اور صحیح کے پرکھنے کے لئے اپنی کتاب (قرآن مجید) کو معیار قرار دیا تھا۔ یہی اسلام میں سند اور حجت ہے۔ زمانۂ نزول قرآن میں مختلف اقوام میں جو کچھ مذہب کے نام سے پیش کیا جاتا تھا، قرآن نے اپنے اس معیار کے مطابق اس کا جائزہ لیا۔ اور صحیح کو غلط سے الگ کر کے رکھ دیا۔ اس طرح وہ دین اپنی حقیقی شکل میں دنیا کے سامنے آگیا۔ جسے نوعِ انسانی کے لئے ضابطۂ زندگی قرار دیا گیا تھا۔ اس کے بعد، اس دین میں انسانی فکر اور دیگر مذاہب کے عقائد اور مسالک کو داخل کر کے اُسے مذہب کی سطح پر لے آیا گیا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ہم آج اُسی مقام پر کھڑے ہیں، جس مقام پر نزولِ قرآن کے زمانے میں مختلف اہلِ مذاہب تھے۔ لہٰذا دینِ حقیقی سے ان غیر اسلامی تصورات و مسالک کو الگ کرنے کے لئے آج بھی وہی طریق اختیار کرنا ہوگا جو اس زمانے میں اختیار کیا گیا تھا۔ یعنی اس وقت جو کچھ اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا ہے، اُسے قرآن کے ترازو میں تول کر دیکھ لیا جائے۔ جو کچھ اس پر پورا اترے، اُسے صحیح سمجھ کر اختیار کر لیا جائے۔ جو غلط ثابت ہو، اُسے مسترد کر دیا جائے۔ لیکن مذہبی پیشوائیت (نزولِ قرآن کے زمانہ میں اس کے لئے آمادہ ہوئی تھی، نہ اب آمادہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ "دین" کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ "مذہب" ہوتا ہے اسی بناء پر علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ اسلام مذہب کے خلاف احتجاج ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اپنی عمر کے آخری حصے میں اُن کے پیشِ نظر اسلام کے متعلق ایک کتاب لکھنے کا پروگرام تھا، جس کا عمودی نکتہ یہی تھا۔ میں نے اس نظریہ کے مطابق انگریزی زبان میں ایک کتاب شائع کی ہے۔ جس کا نام ہے۔ (ISLAMIA CHALLENGE .TO RELIGION) اسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور مغربی مفکرین بھی اس سے خاصے متاثر ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ دین اور مذہب کا یہ فرق اُن کے سامنے پہلی مرتبہ آیا ہے۔

اس ضمن میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآن کی بھی مختلف تعبیریں ہو سکتی ہیں، اس لئے غلط اور صحیح کے پرکھنے میں قرآنی معیار کے نتائج میں بھی فرق ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے اعتراضات درحقیقت قرآن کو سند و حجت تسلیم نہ کرنے کیلئے گریز کی راہیں ہیں۔ قرآن کریم میں جو مابعد الطبیعاتی حقائق آئے ہیں، ان کے سمجھنے میں تو انسانی فکر میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن جن امور کا تعلق انسانی راہنمائی سے ہے (اور یہی قرآن کا بنیادی مقصد ہے) ان میں وہ بالکل واضح اور متعین تعلیم پیش کرتا ہے، جس کی مختلف تعبیریں ہو نہیں سکتیں۔ بشرطیکہ قرآن کو خود اس کے اپنے تجویز فرمودہ طریق سے سمجھا جائے۔

سوال نمبر ۳

کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ علمائے سلف کے رشحات و افکار پر آپ کی تنقیدیں نئی پود کے دماغوں اور دلوں میں اسلام کی ارادت کو کمزور کرتی ہیں اور پرانے لوگوں میں اشتعال کا باعث ہوتی ہیں۔

جواب

دین کے معاملے میں میرا مسلک وہ ہے جسے میں نے سوال نمبر ۲ کے جواب میں بیان کیا ہے یعنی اس وقت جو کچھ ہمارے

ہاں (یعنی مسلمانوں میں) اسلام کے نام سے مروّج ہے، میں اُسے قرآن کے معیار کے مطابق پرکھتا ہوں اور جو عقیدہ، نظریہ، مسلک و مشرب اُس کے خلاف جاتا ہے، اُس کے متعلق کہتا ہوں کہ وہ اسلامی نہیں، غیر اسلامی ہے۔ میری تنقیدیں (علمائے سلف کے) رشحات کے خلاف ہوتی ہیں، نہ سلف کے افکار کے خلاف۔ میری تنقیدیں ہر خلافِ قرآن عقیدہ اور مسلک کے خلاف ہوتی ہیں۔ عقائد (خواہ وہ کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں) انسان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوتے ہیں، اس لئے وہ ان کے خلاف کچھ سننے کے لئے بآسانی تیار نہیں ہوتا۔ (آپ نے دیکھا نہیں کہ ہندو گائے کے خلاف بھی ایک لفظ تک برداشت نہیں کر سکتا، حالانکہ اس پر ساری دنیا ہنستی ہے۔) جو کچھ میں قرآن سے پیش کرتا ہوں، اس کی تردید کے لئے چونکہ ہمارے قدامت پرست طبقہ کے پاس دلائل و براہین نہیں ہوتیں، اس لئے وہ خود بھی مشتعل ہو جاتا ہے اور عوام کو بھی مشتعل کرتا ہے۔ اندریں حالات میرے لئے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو میں (اسوۂ رسول اللہ کے اتباع میں) ان کے اشتعال کو برداشت کر دوں اور اپنے مشن پر استقامت سے قائم رہوں اور یا اس مشن کو چھوڑ دوں۔ یہ دوسرا راستہ میرے لئے دین و دنیا میں روسیاہی کا باعث ہوگا۔ اس لئے مجھے لامحالہ اپنی روش پر گامزن رہنا ہوگا۔ میں اپنی عمر کا بیشتر راستہ طے کر چکا ہوں اور اب تھوڑی سی منزل باقی رہتی ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مجھے اسی راستے پر استقامت سے گامزن رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

میں اتنی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی تنقیدات میں متقدمین یا متاخرین میں سے کسی کے خلاف کبھی بدتمیزی سے کام نہیں لیا۔ ہمیشہ تہذیب اور شرافت کے دامن کو تھامے رکھا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس سے ناراض ہوتا ہے کہ اس کے کسی بزرگ کی طرف منسوب کردہ کسی عقیدہ یا مسلک کے متعلق میں یہ کیوں کہتا ہوں کہ وہ خلافِ قرآن ہے تو اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔

میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی کسی تحقیق کے متعلق کبھی یہ نہیں کہا کہ وہ حرفِ آخر ہے۔ اور سہو و خطا سے پاک، میں ہمیشہ یہ کہتا ہوں کہ وہ بہرحال ایک انسانی کوشش ہے، جس میں سہو و خطا اور مزید غور و فکر کی ہمیشہ گنجائش ہوتی ہے۔ میں نے کوئی فرقہ بھی پیدا نہیں کیا کہ میری تحقیق میرے متبعین کے لئے سند اور حجت بن جائے۔ میں اپنے فکری نتائج کو پوری قوم کے سامنے پیش کرتا ہوں اور دعوتِ غور و فکر دیتا ہوں۔ مقصد میرا یہ ہے کہ قوم میں سوچنے کی صلاحیت بیدار ہو اور وہ جس نظریہ یا عقیدہ کو قبول کرے علیٰ وجہ البصیرت قبول کرے۔ میری تنقیدات سے نئی پود کے دماغوں اور دلوں میں اسلام کی ارادت کمزور نہیں ہو رہی۔ اسلام سے اُن کی ارادت ان عقائد و نظریات کی وجہ سے کم ہو رہی ہے جسے ہمارا قدامت پرست طبقہ اسلام کے نام سے پیش کرتا ہے۔ اسی سے وہ اسلام سے سرکشی اور برگشتگی کی حد تک پہنچ رہے ہیں۔ میری پیش کردہ قرآنی فکر سے ہزارہا نوجوان اسلام کے گرویدہ ہو چکے ہیں، اور یہ دائرہ دن بدن وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

سوال ۴

علامہ اقبالؒ سے متعلق پاکستان میں جو کتابیں مختلف اہلِ قلم کی معرفت منصّہ شہود پر آئی ہیں کیا وہ اقبالؒ کی فکر سے انصاف کرتی ہیں؟

جواب

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ علامہ اقبالؒ سے متعلق پاکستان یا بیرونِ پاکستان جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں، وہ سب میری نظر سے گزر چکی ہیں۔ لیکن جتنی کتابیں دیکھنے کا مجھے موقع ملا ہے، بہ اکراہ کہتا ہوں کہ مصنفین سے معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ میرے نزدیک وہ اقبال کی فکر سے انصاف نہیں کر پائے۔ حضرت علامہؒ نے، بہ تکرار و اصرار، اس حقیقت کو دہرایا ہے کہ ان کی فکر کا بنیادی سرچشمہ قرآنِ حکیم ہے۔ لہٰذا فکرِ اقبالؒ سے وہ (اور صرف وہ) کتاب انصاف کر سکے گی جو ان کی پیش کردہ فکر کا جائزہ قرآنی فکر کی روشنی میں لے اور اسی بنیادی نکتہ کو اپنی تحقیق کا محور قرار دے۔

سوال ۵

پاکستان کے صوبائی تعصبات کو روکنے کے لئے ہم کن نظریاتی بنیادوں کو قوم کے اجتماعی ضمیر سے ہم آہنگ کر سکتے ہیں؟

جواب

اصولی طور پر اس سوال کا جواب سوال ۱ کے جواب میں مل جائیگا۔ ہمارے ہاں صوبوں کی اصل و حقیقت اس سے زیادہ کیا ہے کہ انگریز نے انتظامی سہولتوں کی خاطر ملک کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ لیکن اب ان صوبوں کی لکیریں ایک دوسرے کو ڈسنے کے لئے سانپ بن گئی ہیں۔ حتیٰ کہ جو حضرات تقسیمِ ہند سے پہلے پورے ہندوستان میں بسنے والے باشندوں کو ایک قوم قرار دیتے تھے اور اس پر انہیں شدت سے اصرار تھا، وہ اب مغربی پاکستان کی چار دیواری کے اندر ان صوبوں کی لکیروں کی بنیاد پر چار قومیتوں کے وجود کے داعی بن رہے ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے سوال کے جواب میں عرض کیا ہے، اصلاً اور اساساً تمام دنیا کے مسلمان ایک قوم کے افراد ہیں لیکن، بہ حالاتِ موجودہ، ایک مملکت کے اندر بسنے والے مسلمان تو ایک قوم تسلیم کئے جانے چاہئیں۔ مغربی پاکستان میں اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری تھا کہ ان صوبوں کی تفریق کو ختم کر کے پاکستان کو ایک ملک تسلیم کیا جائے۔ اور ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر وحدتِ امت کے نظریہ کو وہ اساس قرار دیا جائے جس پر ہماری زندگی کی پوری عمارت استوار ہو۔ ون یونٹ اس سمت ایک اچھا قدم اٹھایا گیا تھا۔ لیکن افسوس کہ انتظامی خرابیوں کی وجہ سے وہ کامیاب نہ ہو سکا اور تفریق پسند گروہوں نے اس کی ناکامی سے فائدہ اٹھا کر ملک کو پھر چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر نظریہ پاکستان پر دیانتداری سے عمل کیا جائے تو ہمارے اس چھوٹے سے ملک میں وحدانی اندازِ حکومت کیوں کامیاب ثابت نہ ہو سکے۔ باقی رہا قوم کا اجتماعی ضمیر، تو جیسے میں نے پہلے عرض کیا ہے، یہاں ابھی تک قوم ہی متشکل نہیں ہوئی تو اس کا اجتماعی ضمیر کہاں سے پیدا ہو گا؟ اجتماعی ضمیر پیدا ہوا کرتا ہے، وحدتِ فکر و نظر سے، جسے بالفاظِ دیگر، ایمان کہا جاتا ہے۔ ہماری ساری کوششیں افرادِ قوم میں (اقدارِ خداوندی کی بنیادوں پر، جو قرآن کریم میں محفوظ ہیں) ہم آہنگیٔ فکر و نظر پیدا کرنے کے لئے صرف ہونی چاہئیں۔ اس کے سوا صوبائی تعصبات کے ختم کرنے کی کوئی صورت نہیں۔

سوال نمبر ۶

ہمارا ادب (نثر و نظم) کس رُخ پر جا رہا ہے؟

جواب

رُخ کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ سامنے کوئی متعیّن منزل یا نصب العین ہو۔ اس وقت قوم کے سامنے کوئی متعیّن نصب العین نہیں، اس لئے اس کی فکر کے کسی خاص سمت جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت ہر طرف انتشار ہی انتشار ہے۔ انتشار کے اسی بگولے میں ہمارا ادب بھی عفریتی ناچ، ناچ رہا ہے۔ یا یوں کہئے کہ اس بگولے کی زد میں آ کر بے مقصد حرکتوں میں مصروف ہے۔ جھکّڑ میں ہواؤں کا رُخ کب متعین ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں "ایمان" تو ایک طرف، "کفر" کا بھی کوئی رُخ متعین نہیں۔

سوال نمبر ۷

آپ پر احادیث کے استخفاف کے الزام کی نوعیت میں صحیح اور غلط کا تناسب کیا ہے؟

جواب

آپ نے میرے خلاف اس الزام کی یاد تازہ کرا کر —— اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے۔ جو شخص اُس ہستی تک کا نام بصد عقیدت و احترام لیتا ہو، جس کی خاک کے ذرّوں کو عالمِ انسانیت کی بلند ترین ہستی کی پابوسی کا شرف حاصل ہے، اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے ارشاداتِ گرامی کا استخفاف کرتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس سے سنگین تر الزام کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ اس کی نوعیت میں صحیح اور غلط کے تناسب کا کیا سوال، یہ یکسر کذب و افترا ہے، جسے ایک منظم پروپیگنڈے کی رُو سے مسلسل پھیلایا گیا ہے۔ اس پروپیگنڈے کی شدت اور وسعت سمجھ میں نہیں آ سکتی، جب تک میں کوئی مثال پیش نہ کر دوں۔ میں عام طور پر شخصیتوں میں نہیں الجھا کرتا لیکن چونکہ مثال میں شخصیت کا ذکر ناگزیر ہے، اس لئے اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔

محترم آغا شورش کاشمیری کی تالیف —— فیضانِ اقبالؔ —— کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اس کا مقدمہ ڈاکٹر سیّد عبداللہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے، وہ اپنے اس مقدمہ میں 'بلا موقع اور محل' مجھے گھسیٹ لائے ہیں اور فرماتے ہیں۔

لاہور میں یہ بھی طلوع ہوا ہے کہ ایک شخص جو شخصیتِ رسولؐ کی اہمیت گھٹانے پر مامور ہے اور دین کو کچھ نو امیر مسلمانوں کے سہل اور رغیر ذمہ دار طرزِ زندگی کے مطابق ڈھالنے کے لئے ایک فرقے کی بنیاد رکھ چکا ہے، بدقسمتی سے اپنی مجلس کی رونق اشعارِ اقبال ہی سے بڑھا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص رسولؐ ہی کو نہیں مانتا اور اپنے آپ کو قرآن کا عمرؓ وابوبکرؓ سے بہتر مفسر سمجھتا ہے، وہ اقبالؒ کو کیا مانے گا۔ مگر رونق بڑھانے کے لئے اشعار

اقبال کو یہ بھی لگا تا ہے۔ (صفحہ ۲۳-۲۲)

آپ غور کیجئے کہ ان چند سطروں میں کتنے الزامات ہیں جو میرے خلاف عائد کئے گئے ہیں اور ان میں سے ہر الزام کس قدر جگر پاش اور جانسوز ہے۔ پھر یہ بھی سوچئے کہ جب 'عوام کیا، خواص مسلمانوں تک کے سامنے کسی شخص کا یہ نقشہ کھینچا جائے تو ان کا خون کس قدر نہیں کھولے گا؟ میں نے حسب معمول اس زہرافشانی کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر میرا دامن راستے کی ان خاردار جھاڑیوں میں الجھ جائے تو میں اپنی منزل کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکوں گا۔ لیکن طلوع اسلام کی سابقہ کنونشن میں کراچی کے ایک دوست نے اس کا تذکرہ چھیڑ دیا جو بعد میں طلوع اسلام میں شائع ہوا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا گیا تھا کہ اُن کے پاس ان الزامات کا کوئی ثبوت ہے؟ واضح رہے کہ ڈاکٹر صاحب سے میری آج تک کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ میرے درس یا کنونشن میں سامع کی حیثیت سے بھی کبھی شریک نہیں ہوتے لہٰذا ان الزامات کا ثبوت میری تحریروں ہی سے پیش کیا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے خطوط میں اس کا اعتراف کیا کہ اس کا کوئی ثبوت اُن کے پاس نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یہ لکھا (کیونکہ وہ اپنے خطوط کی نقول مجھے بھی بھیجتے رہے تھے۔) کہ اُن کے خطوط شائع نہ کئے جائیں۔

آپ سوچئے کہ جب ڈاکٹر سید عبداللہ جیسا ذمہ دار شخص میرے خلاف بلا ثبوت اس قسم کے سنگین الزامات عائد کرنے میں کوئی باک نہیں سمجھتا تو مذہبی مکاتب کے شوریدہ سر طلبا یا افسانہ گو واعظ کس حد تک نہیں جا سکتے؟ اگر ڈاکٹر صاحب نے میری صرف ایک کتاب جو حضور نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ پر مشتمل ہے اور جس کا نام — معراج انسانیت — ہی اس امر پر دال ہے کہ میرے نزدیک مقام محمدیؐ کی رفعت و عظمت کیا ہے۔ تو انہیں کم از کم اس کا احساس ہو جاتا کہ وہ کس کے خلاف، کیا الزام عائد کر رہے ہیں۔ میں نے یہ سیرت اصولاً قرآن کریم سے مرتب کی ہے اور اس کی تائید میں وہ احادیث پیش کی ہیں جو ہمارے روایات کے مجموعوں میں موجود ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن جو بڑی تقطیع کے قریب نو سو صفحات پر مشتمل ہے، ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اور ملک میں کافی مقبول اور مشہور ہوا تھا۔ میں یہ تفصیل اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اس قسم کی کتاب کا کم از کم نام تو سید صاحب نے سنا ہو گا۔ اگر وہ پوری کتاب نہیں، اس کا "مطلع انوار" ہی ملاحظہ فرما لیتے تو انہیں اس کے آخر میں یہ سطور دکھائی دیتیں۔

"خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا' آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرف انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دئے جانے تھے وہ اُن کی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے، اس کے بعد انسان کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی اور مشعل راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراط مستقیم ہے جس پر اُس ذات اقدس و اعظم کے لغزش قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ دل پکارا اٹھتا ہے کہ

مقام خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفےٰ رو

یہ تھا وہ حاصل بہار چمن کائنات کہ جس کا تبسم صبح بہار کائنات تھا۔"

یہ تھی ایک مثال اس پروپیگنڈہ کی جو میرے خلاف گذشتہ پچیس سال سے مسلسل جاری ہے۔

۲۔ احادیث کی پوزیشن یہ ہے کہ ان کے متعلق کسی کا بھی یہ دعویٰ نہیں کہ وہ سن و عن حضور نبی اکرمؐ کے ارشادات ہیں۔ ان کے متعلق دعویٰ اور عقیدہ یہی ہے کہ وہ اقوال منسوب الی الرسول ہیں۔ اس فرق کی وضاحت سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

قولِ رسول اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں، لازماً ایک ہی چیز نہیں اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیاتِ قرآنی کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیاتِ قرآنی کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں، بخلاف اس کے، روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو نبیؐ کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں۔

(رسائل و مسائل حصہ اوّل صفحہ ۴۷)

ان احادیث کے صحیح یا غلط ہونے کے معیار کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہؐ کی طرف منسوب ہو اُس کی نسبت کا صحیح اور غلط ہونا بجائے خود زیرِ بحث ہوتا ہے۔ آپ (اُن کے فریقِ مقابل) کے نزدیک ہر اُس روایت کو حدیثِ رسول مان لینا ضروری ہے، جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی حجت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ (ایضاً صفحہ ۲۹)

احادیث کے متعلق میرا بھی یہی مسلک ہے، اس فرق کے ساتھ کہ مودودی صاحب کے نزدیک اس بات کا فیصلہ کہ فلاں حدیث جسے حضورؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے صحیح ہے یا غلط "مزاج شناسِ رسول" کی نگہ بصیرت کر سکتی ہے اور میرا مسلک یہ ہے کہ

"کوئی روایت جو قرآن کریم کے خلاف ہو یا جس سے حضور نبی اکرمؐ کی ذات اقدس و اعظم پر طعن پڑتا ہو، یا اس سے صحابۂ کبارؓ کی سیرت داغدار ہوتی ہو، وہ روایت صحیح نہیں ہو سکتی۔

یہ ہے وہ معیار، جس پر میں احادیث کو پرکھتا ہوں اور جو اس معیار پر پوری نہیں اُترتیں، اُن کے متعلق کہتا ہوں کہ وہ رسول اللہؐ کی احادیث ہو نہیں سکتیں، حضورؐ کی طرف اُن کی نسبت غلط ہے۔ ان وضعی روایات میں ایسی بھی ہیں، جنہیں دیکھ کر انسان کی نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ جب میں مثال کے طور پر اس قسم کی وضعی روایات سامنے لاتا ہوں تو عوام کو یہ کہہ کر مشتعل کر دیا جاتا ہے کہ دیکھئے یہ شخص (معاذ اللہ) احادیثِ رسول اللہؐ کا استخفاف کرتا ہے۔ (گنجائش اس کی ہے ورنہ میں اس قسم کی روایات کی چند مثالیں بھی پیش کرتا)

سوال نمبر ۸

کیا آپ ہماری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بہرحال (جزوی اختلافات سے قطع نظر) نئی نسلوں کے اذہان میں اسلام کے لئے ارادت کی حد تک بختگی پیدا کی ہے؟

جواب:۔ معاف فرمایئے، مجھے نہ صرف یہ کہ آپ کی اس رائے سے اختلاف ہے بلکہ میری رائے اس کے بالکل برعکس

ہے۔ میری رائے اور تجربہ یہ ہے کہ نئی نسل کے سمجھنے سوچنے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو مودودی صاحب نے اسلام سے بُری طرح برگشتہ کیا ہے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ میری اس رائے سے سخت اختلاف کیا جائے گا لیکن میں کوئی بات بلا دلیل اور بلا ثبوت نہیں کہا کرتا۔ جو کچھ میں نے کہا ہے اس کے لئے میرے پاس دلائل اور شواہد ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بھی واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مودودی صاحب سے میری کوئی ذاتی مخاصمت نہیں۔ اُن کے ساتھ میرے نہایت خوشگوار تعلقات، ان کے قیام دکن کے دوران سے چلے آ رہے تھے۔ وہ دہلی تشریف لاتے تو اُن کا میرے ہاں آنا جانا رہتا۔ ان کے دارالاسلام (پٹھان کوٹ) تشریف لے جانے میں میرا بھی ہاتھ تھا۔ (میں اس داستان کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ موضوعِ زیرِ نظر سے اس کا بنیادی تعلق نہیں) میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان کے شمالی ہند کی طرف منتقل ہونے تک اور اس کے بعد بھی ان کے ساتھ میرے تعلقات خوشگوار تھے لیکن جب انہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تو میں نے پہلے انہیں اپنے طور پر سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن جب اس پر بھی انہوں نے اپنی روش نہ بدلی تو مجھے لامحالہ اُن کی مخالفت کرنی پڑی۔ پاکستان آنے کے بعد خود اسلام کے متعلق جو روش انہوں نے اختیار کی، اس کی مجھے بڑی شدت سے مخالفت کرنی پڑی کیونکہ مجھے اس کا احساس تھا کہ اس کے نتائج بڑے دوررس اور خطرناک ہو سکتے ہیں۔ یہاں میں اس امر کی مزید وضاحت کر دوں کہ میں نے دکوئی مذہبی فرقہ بنایا ہے نہ سیاسی پارٹی۔ نہ ہی میں عملی سیاسیات میں حصہ لیتا ہوں۔ اسلئے یہاں بھی ان کے ساتھ میری ذاتی مخاصمت یا رقابت کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ میری مخالفت اصولی ہے اور اس کا جذبۂ محرکہ دینی ہے جس کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا ہے۔ اُن کے پیش کردہ اسلام کی دو امتیازی خصوصیات ہیں۔ ایک تو وہ اُن کی مصلحتوں کے مطابق بدلتا رہتا ہے اور دوسرے اس سے ایسے شکوک و شبہات ابھرتے ہیں جو رفتہ رفتہ ایک سوچنے والے ذہن کو اسلام سے برگشتہ کر دیتے ہیں۔ ان کا پیش کردہ اسلام کس قدر تضادات کا مجموعہ اور شکوک و شبہات پیدا کرنے والے مواد کا مرکب ہے۔ اس کی تفصیل کے لئے ایک اچھی خاصی کتاب درکار ہو گی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ایسی کتاب کی بے حد ضرورت ہے۔ لیکن میں اس مقام پر اس کی دو چار مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ پہلے تضادات کو لیجئے۔

(۱) تشکیلِ پاکستان کے بعد پہلے انتخابات ۱۹۵۱ء میں منعقد ہوئے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان کی جماعت انتخابات میں حصہ نہیں لے گی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے لکھا:

> اب ہم کو اس امر میں کوئی شک نہیں رہا کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے گندا کیا ہے، ان میں سے ایک امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعت اسلامی نے فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریقِ انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ جماعت اسلامی نہ اپنے پارٹی ٹکٹ پر آدمی کھڑے کرے گی، نہ اپنے ارکان کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دے گی۔ نہ کسی ایسے شخص کی تائید کرے گی جو خود امیدوار ہو اور اپنے لئے ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے، خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی ٹکٹ پر۔ یہی نہیں بلکہ جماعت اپنی انتخابی جدوجہد میں خاص طور پر یہ بات عوام الناس کے ذہن نشین کرے گی کہ امیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نا اہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب کبھی اور جہاں کہیں سامنے آئے، لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہیئے کہ

یہ ایک خطرناک شخص ہے۔ اس کو ووٹ دینا، اپنے حق میں کانٹے بونا ہے۔
(جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد مطبوعہ ترجمان القرآن اکتوبر ۱۹۵۰ء)

اس کے بعد جب ۱۹۵۶ء کے دستور کے ماتحت انتخابات کا موقع آیا تو انہوں نے ان میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اور اس سلسلے میں لکھا:

جماعت اسلامی نے ۱۹۵۸ء کے انتخابات کے موقع پر ایک پالیسی کا اعلان کیا تھا۔ اور وہ یہ تھی کہ امیدواری چونکہ اسلام میں ناجائز ہے، اس لئے ہم نہ خود امیدوار بن کر کھڑے ہوں گے اور نہ کسی امیدوار کو ووٹ دیں گے۔ بعد میں تجربات سے ہم کو معلوم ہوا کہ ہم ابھی اس پوزیشن میں نہیں کہ ہر ضمنی اور عام انتخابات میں پورے ملک کی ہر نشست کے لئے اپنے معیار مطلوب کے مطابق موزوں امیدوار کھڑے کر سکیں ... اس بنا پر ہم نے سابقہ پالیسی میں یہ تغیر کر دیا کہ ہم خود تو امیدوار بن کر کھڑے ہونے سے بدستور مجتنب رہیں گے لیکن فاسد عناصر کے شر کو رفع کرنے اور ان کے مقابلے میں نسبتاً صالح اور اسلامی نظام کے حامی عناصر کو آگے بڑھانے کے لئے جن امیدواروں کی تائید ناگزیر محسوس ہو گی، انہیں ووٹ دیں گے بھی اور دلوائیں گے بھی۔ (ترجمان القرآن بابت مئی ۱۹۵۸ء)

آپ نے خود فرمایا کہ مودودی صاحب کا یہ اعلان اس سے پہلے فیصلے سے یکسر متضاد ہے لیکن اس کے ساتھ انہوں نے فرمایا کہ

ہر معقول آدمی بہ یک نظر محسوس کرے گا کہ ہماری یہ نئی پالیسی ٹھیک ٹھیک دینی نظام کے مطابق ہے اور اس میں دراصل کوئی اصولی شکنی نہیں کی گئی۔ (ایضاً)

اس کے بعد ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے موقع پر انہوں نے اعلان کیا کہ

جماعت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ آئندہ انتخابات میں حصہ لے گی اور مغربی اور مشرقی پاکستان کی تمام نشستوں پر اپنے آدمی کھڑے کرے گی۔ (انتخابی منشور کے سلسلے میں مودودی صاحب کا بیان ــــ)

(۲) ایک مثال اور لیجئے۔ یہ سوال بڑا بنیادی ہے۔ اور ہمارے زمانے میں اس نے خاص طور پر اہمیت حاصل کر لی ہے کہ اسلام کی رو سے ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت جائز ہے یا نہیں اور کیا حکومت کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ زمین کی انفرادی ملکیت کی تحدید کر دے۔ اس سلسلے میں مودودی صاحب نے اپنی کتاب (مسئلہ ملکیت زمین) میں لکھا تھا۔

اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ہے۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جب کہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں بلا حد نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ روپیہ پیسہ، جائز استعمالی اشیاء، مکانات، سواری غرضیکہ کسی چیز کے معاملے میں قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے پھر آخر تنہا زرعی جائیداد میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس کے معاملے میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے حقوق ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک حد خاص سے زائد ملکیت کو آدمی کے لئے عملاً بیکار

کر دے۔ (مسئلہ ملکیت زمین پہلا ایڈیشن، صفحہ ۵۲-۵۳)

جہاں تک نیشنلائزیشن کا تعلق ہے۔ انہوں نے تحریر فرمایا تھا کہ

اس سے ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہوتا ہے، جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا۔ (ایضاً صفحہ)

لیکن ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے موقعہ پر جب پیپلز پارٹی نے اس مسئلہ کو انتخابی مہم کا عمودی نکتہ بنا کر پیش کیا تو جماعت اسلامی نے اپنے منشور میں لکھا۔

قدیم املاک کے معاملے میں زمین کی ملکیت کو ایک خاص حد تک محدود کر دیا جائے گا۔ مغربی پاکستان کے زرخیز علاقوں میں یہ حد زمین کی پیداواری صلاحیت کے لحاظ سے سو اور دو سو ایکڑ کے درمیان ہو گی اور جن علاقوں میں زمین کی پیداواری صلاحیت بہت کم ہے وہاں اس معیار کے لحاظ سے حد مقرر کی جائے گی۔ مشرقی پاکستان میں سو بیگھہ کی حد رکھی جائے۔

جہاں تک نیشنلائزیشن کا تعلق ہے، اس منشور میں کہا گیا کہ

ہم قومی ملکیت کے نظام کو بطور اصول اختیار کرنے کے مخالف ہیں لیکن جن صنعتوں کو کلیدی اور بنیادی اہمیت حاصل ہے اور جن کا نجی حیثیت سے چلنا اجتماعی حیثیت سے نقصان دہ ہے، انہیں قومی ملکیت میں بحاظر لے لینے یا خود حکومت کے انتظام میں قائم کرنے اور چلانے کو ناجائز بھی نہیں سمجھتے۔

آپ سوچئے کہ جب ایک سنجیدہ، تعلیم یافتہ، نوجوان ان تضادات پر غور کرے گا۔ اور ان کا اس دعویٰ کی روشنی میں جائزہ لے گا۔ کہ یہ سب اسلام کے مطابق ہیں، تو اس اسلام کے متعلق وہ کس نتیجے پر پہنچے گا۔

اب اس مسئلہ کے دوسرے حصہ کی طرف آیئے اور دیکھئے کہ مودودی صاحب کا پیش کردہ اسلام اور تو اور خود حضور رسالتمآب کی ذات گرامی کے متعلق کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ کوئی پندرہ سولہ سال اُدھر جماعت اسلامی کے کچھ اراکین نے جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ان میں اس جماعت کے بعض نہایت سربرآوردہ حضرات بھی شامل تھے۔ انہوں نے مودودی صاحب کے خلاف جو الزامات عائد کئے تھے۔ ان میں ایک یہ بھی تھا، کہ وہ اکثر غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا، کہ اگر میں نے یہ کچھ کیا ہے تو کون سا جرم کیا ہے۔ خود رسول اللہ بھی (توبہ توبہ معاذ اللہ) یہی کچھ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے اصولی طور پر یہ لکھا کہ

راستبازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں، جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے۔ بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔

اس "اصول" کے بعد کہا۔

اس کی عملی مثالیں بھی احادیث میں موجود ہیں۔ کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمد بن مسلمہ کو جب حضور نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں؟ حضورؐ نے بالفاظ صریح انہیں اس کی اجازت دے دی۔ (ترجمان القرآن بابت مئی ۱۹۵۸ء)

میں یہاں اسے دُہرا دوں کہ (جیسا کہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں) مودودی صاحب کے نزدیک ہمارے احادیث کے مجموعوں میں درج شدہ ہر حدیث صحیح نہیں ہے وہ صرف اُسی حدیث کو صحیح مانتے ہیں، جسے اُن کی نگہ بصیرت صحیح قرار دے دے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ اس حدیث کو خود اپنی تحقیق کی رُو سے تسلیم کرتے ہیں۔

ان کے خلاف دوسرا اعتراض یہ تھا کہ جماعت کی تاسیس کے زمانے میں وہ بڑے بلند آہنگ اصول پیش فرمایا کرتے تھے، لیکن جب وہ پاکستان میں اقتدار کے پیچھے پڑے تو انہوں نے ان تمام اصولوں کو پس پشت ڈال دیا۔ اس کے جواب میں بھی مودودی صاحب نے فرمایا کہ (معاذ اللہ) خود رسول اللہؐ نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا۔

اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرقِ مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبانِ مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر داخلی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ الائمۃ مِن قریش ..... "امام قریش میں سے ہوں گے"۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں یہ ہدایت مساوات کے اس اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ (رسائل و مسائل حصہ چہارم صفحہ ۳۲۹)

آپ سوچئے کہ جو کچھ مودودی صاحب فرما رہے ہیں، اُس سے ہماری نئی پود کے سنجیدہ طبقہ کے ذہن میں، اسلام تو ایک طرف خود ذاتِ رسالتمآبؐ کے متعلق کیا تصوّر پیدا ہوگا۔

ضمناً یہ دونوں روایتیں وضعی ہیں۔ اس لئے کہ یہ قرآن کریم کی تعلیم کے بھی خلاف ہیں اور حضور نبی اکرمؐ کی پاکیزہ اور بلند سیرت کے بھی منافی لیکن مودودی صاحب انہیں صحیح قرار دیتے ہیں کیونکہ اس سے انہیں اپنے مؤقف کی تائید حاصل ہوتی ہے اور ایسا کرنے میں یہ خیال انہیں قطعاً نہیں ستاتا کہ ان کے اس نشتر کی زد کہاں تک پہنچتی ہے وہ اکثر ایسا کرتے ہیں اس قسم کی ہیں وہ روایات جن کی میں مخالفت کرتا ہوں اور جس کی پاداش میں مجھے منکرِ حدیث، منکرِ شانِ رسالت اور نہ جانے کیا کیا کہا جاتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ میں ان روایات کو غلط کیوں قرار دیتا ہوں بلکہ اس لئے کہ ان کے غلط قرار دینے سے خود مودودی صاحب بے نقاب ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔

اس کے بعد آیئے قرآنی حقائق کی طرف۔ مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن کی حال ہی میں تکمیل ہوئی ہے۔ اس پر جس شان کے جشن منائے گئے ہیں اور اس تفسیر کی تعریف میں جو کچھ کہا گیا ہے، اُس سے آپ واقف ہوں گے، لیکن دیکھئے کہ اس تفسیر میں کس قسم کا قرآن پیش کیا گیا ہے۔ صرف دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) تفسیر کی پہلی جلد میں کہا گیا ہے (اور اس کی تفصیل اس سے پہلے مودودی صاحب اپنی کتاب تفہیمات حصہ دوم میں بھی بیان کر چکے ہیں) کہ جنگ میں گرفتار شدہ دشمن کی عورتوں کو سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے گا اور وہ ان سے بغیر نکاح اور بلا لحاظ تعداد جنسی تمتع کر سکیں گے اور جب جی چاہے انہیں فروخت بھی کر سکیں گے۔
(تفہیم القرآن جلد اول ۱۹۵۱ء ایڈیشن صفحہ ۳۴۰ و تفہیمات حصہ دوم صفحہ ۲۹۲ سے آگے)

(۲) جنت کی حوروں کے متعلق وہ اپنی تحقیق یوں پیش کرتے ہیں۔ بعید نہیں ہے کہ یہ وہ لڑکیاں ہوں جو دنیا میں

سنِ رُشد میں پہنچنے سے پہلے مر گئی ہوں اور جن کے والدین جنت میں جانے کے مستحق نہ ہوئے ہوں۔ یہ بات اس قیاس کی بنا پر کہی جا سکتی ہے کہ جس طرح ایسے لڑکے اہلِ جنت کی خدمت کے لئے مقرر کر دیئے جائیں گے اور وہ ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، اسی طرح ایسی لڑکیاں بھی اہلِ جنت کے لئے حوریں بنا دی جائیں گی اور وہ ہمیشہ نوخیز لڑکیاں ہی رہیں گی۔ (تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۲۸)

(۳) سورہ الرحمٰن کی آیت حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں۔

خیموں سے مراد غالباً اس طرح کے خیمے ہیں، جیسے اُمراء و رؤساء کے لئے سیرگاہوں میں لگائے جاتے ہیں اغلب یہ ہے کہ اہلِ جنت کی بیویاں ان کے ساتھ قصروں میں رہیں گی اور ان کی سیرگاہوں میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوں گے، جن میں حوریں ان کے لئے لطف و لذت کا سامان فراہم کریں گی۔ ہمارے اس قیاس کی بنا یہ ہے کہ پہلے خوب سیرت اور خوب صورت بیویوں کا ذکر کیا جا چکا ہے، اس کے بعد اب حوروں کے ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ ان بیویوں سے مختلف قسم کی خواتین ہوں گی۔ (تفہیم القرآن جلد پنجم صفحہ ۲۶۷)

میں انہی دو چار مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ (جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے) اگر ان کے پیش کردہ اس قسم کے "نوادرات" کو یکجا کیا جائے تو اس سے ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد میں، اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس بات کا فیصلہ اربابِ دانش و بینش پر چھوڑتا ہوں کہ اس سے نوجوانوں کے اذہان میں اسلام کے لئے ارادت پیدا ہو گی یا نفرت؟ اس سے پہلے صورت یہ تھی کہ جب کبھی کوئی نوجوان اس قسم کی لغویات پیش کرتا تو اُسے سمجھا دیا جاتا کہ یہ جہلاء کی باتیں ہیں، اسلام کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اب وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ اسلام وہ شخص پیش کر رہا ہے، جسے دنیا نے اسلام کا عظیم ترین مفکر اور علومِ جدیدہ پر وسیع نگاہ رکھنے والا محقق کہا جاتا ہے۔ لہٰذا آپ انہیں جہلاء کی باتیں کہہ کر مسترد نہیں کر سکتے۔ اور اب تو یہ مصیبت اور بھی آگے بڑھ رہی ہے۔ اب مودودی صاحب کے اس تعارف کے ساتھ اُن کی کتابیں انگریزی میں بھی منتقل ہو رہی ہیں، اس سے دشمنانِ اسلام کو اسلام پر حملہ کرنے کے لئے جس قسم کے حربے ہاتھ آ جائیں گے، وہ ظاہر ہے۔ چونکہ عظمتِ قرآن اور ناموسِ رسالت کا تحفظ میرا جزوِ ایمان اور نصب العینِ حیات ہے اس لئے میں مودودی صاحب کے پیش کردہ اس قسم کے اسلام کی مخالفت اپنا فریضہ سمجھتا ہوں (اور یہی وجہ ہے جو میرے خلاف اس قدر شدید پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔

سوال نمبر ۹

کیا اسلامی وفاق کا قیام ممکن ہے، ممکن ہے تو کب، کہاں اور کس طرح۔ اس کا ابتدائی نقشہ کیا ہو گا؟

جواب

اسلامی ممالک کا وفاق اسی صورت میں ممکن ہے، جب اُن کے دل میں اس حقیقت کو پیدا اور جاگزیں کیا جائے کہ اسلام میں قومیت کا معیار وطن اور نسل کا اشتراک نہیں بلکہ ایمان کا اشتراک ہے۔ اس معیار کی رُو سے دنیا کے مسلمان الگ الگ قومیں نہیں بلکہ ایک اُمت ہیں۔ اس حقیقت پر یقین کے بعد آغازِ کار کیلئے یہ ہو سکتا ہے کہ موجودہ مختلف مملکتیں انتظامی مقاصد کیلئے الگ الگ شکل میں قائم رہیں اور بنیادی امور کیلئے ان میں وفاق یا میثاق قائم کر دیا جائے اور پھر وہ رفتہ رفتہ ایک

مرکز کے تابع آ جائیں۔ جب یہ مرکز قرآن کے تابع ہو گا تو اسے "خلافت علیٰ منہاج نبوت" کہا جائے گا۔

سوال ۱۰

مختصراً وہ کون سی غلط اصطلاحیں، الفاظ اور عقائد ہیں جو اصل اسلام میں نہیں تھے لیکن صدیوں کی گردش سے بہر وجوہ مسلمانوں کے افکار کا حصہ ہو گئے ہیں؟

جواب

اس سوال کا جواب بڑی تفصیل چاہتا ہے، جس کی اس انٹرویو میں گنجائش نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں گذشتہ قریب تیس پینتیس سال سے اسی سوال کا جواب دینے میں اپنی زندگی صرف کر رہا ہوں۔

دین خدا کی طرف سے خالص اور منزہ شکل میں ملتا ہے۔ اس کے بعد اس میں دو بنیادی تبدیلیاں پیدا کرائی جاتی ہیں جن سے وہ مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایک یہ کہ انسانوں کے خود ساختہ نظریات، معتقدات یا رسوم و مسالک کو (خود وضع کر کے یا دوسروں سے مستعار لیکر) دین کا جزو بنا دیا جاتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ دین کی اصطلاحات کا مفہوم بدل دیا جاتا ہے۔ اسلام بھی مذہب کی شکل اختیار کر چکا ہے جس میں یہ دونوں تبدیلیاں آ گئی ہوئی ہیں۔ دین کا صحیح نقشہ سامنے لانے کے لئے بنیادی طور پر کرنے کا کام یہ ہے کہ یہ بتایا جائے کہ ان مروّجہ الفاظ اور اصطلاحات کا دین کی رو سے مفہوم کیا تھا اور اب ان سے کیا مفہوم لیا جاتا ہے۔ میں نے اپنی بساط اور بصیرت کے مطابق اپنی مرتب کردہ "لغات القرآن" میں یہی کیا ہے۔ اور اپنی مختلف تصانیف میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ہمارے ہاں کون سے غیر قرآنی عقائد اور تصورات ہیں جو اسلام کا جزو بن چکے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے۔ اس کے لئے پورے کے پورے مروّجہ اسلام کا جائزہ قرآن کریم کی روشنی میں لینا ہو گا کہ، ان تمام تحریفات اور تغیرات کے باوجود، خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اس نے لئے رکھا ہے۔

سوال ۱۱

اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں کن باتوں کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ہم اس کی اجتماعی روح سے آشنا ہو سکیں؟

جواب

"اسلامی تاریخ" کی اصطلاح وضاحت طلب ہے۔ ایک چیز ہے۔ اسلام کی تاریخ اور دوسری چیز ہے مسلمانوں کی تاریخ۔ اسلام کی تاریخ سے مراد یہ ہے کہ اسلام درحقیقت تھا کیا اور پھر وہ کس طرح رفتہ رفتہ مروّجہ اسلام میں تبدیل ہو گیا۔ جہاں تک میرا علم میری راہنمائی کرتا ہے، اسلام کی اس قسم کی تاریخ ابھی تک مرتب نہیں ہوئی۔ باقی رہی مسلمانوں کی تاریخ تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد مسلمانوں کی سلطنتوں اور حکومتوں کی تاریخ ہے۔

عہدِ محمد رسول اللہ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ کی تاریخ میں اسلام کی تاریخ اور مسلمانوں کی تاریخ میں فرق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس دور سعادت میں مسلمان اسلام کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس دور کی تاریخ بھی ہمارے پاس اپنی حقیقی اور غیر ملوث شکل میں نہیں آئی۔ ہمارے ہاں سب سے پہلی جامعہ تاریخ "تاریخ طبری" ہے۔ جسے اُم التواریخ کہا جاتا ہے۔ یہ تیسری صدی ہجری کے اواخر یا چوتھی صدی کے ابتدا میں کسی سابقہ مستند تحریری ریکارڈ کے بغیر، روایات کی رو سے مرتب ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے اس میں رطب و یابس ہر قسم کی روایات موجود ہیں۔ اس کے بعد مرتب ہونے والی کتب تاریخ کی بنیاد بھی یہی "تاریخ" ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ اسلام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ وضعی احادیث اور ہماری تاریخ ہے ان میں ہر شخص کو اپنے نظریے کی تائید میں روایات مل جاتی ہیں جسے وہ اسلام کہہ کر دنیا کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اُمت کے اختلافات، نزاعات، تفرقات اور غیروں کی طرف سے اعتراضات کا سرچشمہ بھی یہی چیزیں ہیں۔ جہاں تک عہدِ محمد رسول اللہ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ کا تعلق ہے۔ اس کی منزہ تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ حضور نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ ان کی زندگی قرآن کریم کے مطابق تھی لہٰذا ہمیں اُس دور کی تاریخ کو قرآن کی چھلنی میں چھان لینا چاہیئے۔ جو اس کے مطابق ہو۔ اُسے صحیح سمجھ لینا چاہیئے۔ جو اس کے خلاف جائے اُسے مسترد کر دینا چاہیئے۔ میں نے اپنی کتاب سیرت (معراجِ انسانیت) کو اسی معیار کے مطابق مرتب کیا ہے اور اس کا نتیجہ بڑا شاداب اور درخشندہ سامنے آیا ہے۔ اُسے ہم پورے حتم و اعتماد کے ساتھ غیر مسلموں کے ہاتھ میں دے سکتے ہیں۔ اس نے ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل و دماغ میں عظیم انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

باقی رہی بعد کے دور کے مسلمانوں کی تاریخ تو نہ ہم اُن کے اعمال و کردار کی صداقت کے لئے مکلف ہیں، نہ ہی انہیں اسلام کے لئے سند کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

سوال نمبر ۱۲

کیا ہم یورپ کی علمی قیادت کو چیلنج کر سکتے ہیں۔ اگر چیلنج کر سکتے ہیں تو اس کی اساس کیا ہو گی اور اس کی زبان کیا ہونی چاہیئے۔

جواب

یورپ (یا کسی اور قوم یا ملک) کی علمی قیادت کا سوال ایسا نہیں جسے کوئی بنیادی حیثیت حاصل ہو۔ علم الاشیاء (یعنی علم کائنات) کے حصول کی استعداد آدم (یعنی آدمی) کے اندر رکھ دی گئی ہے، جو قوم بھی اس صلاحیت اور استعداد سے کام لے گی وہ اس علم میں آگے بڑھ جائے گی، ایک وقت میں مسلمانوں نے اس سے کام لیا، امامت اقوام ان کے حصے میں آ گئی، اب یورپ کی اقوام نے اس سے کام لیا ہے تو وہ آگے بڑھ گئی ہیں۔ اگر مسلمان اس کے لئے پھر کوشش کریں گے تو یہ اُن سے بھی آگے بڑھ سکتے ہیں۔

اصل سوال اُن مقاصد کا ہے، جن کے لئے اس علم کو حاصل کیا جاتا، اور اُن اقدار کا جن کے مطابق اس علم کو

استعمال کیا جانا چاہیئے۔ یہ مقاصد اور اقدار وحی کی رو سے متعین اور عطا ہوئی ہیں اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ جو قوم علم کو ان مقاصد کے لئے حاصل اور ان اقدار کے مطابق صرف کرے گی، نوعِ انسان کی امامت اس کے حصے میں آئے گی۔ باقی رہا زبان کا سوال سو قرآن کریم کی زبان عربی ہے، اس لئے اس سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے اس زبان کا جاننا ضروری ہے، جہاں تک علوم کائنات کا تعلق ہے اتفاق سے اس کا عظیم اور کثیر ذخیرہ انگریزی زبان میں ہے۔ اس علمی ذخیرہ سے مستفیض ہونے کے لئے اس زبان کی تحصیل بھی ناگزیر ہے۔ جو قوم اس زبان سے (یا اس قسم کی کسی دوسری زبان سے جس میں یہ سرمایہ ہو) بیگانہ ہو جائے گی، وہ اپنے آپ کو نوعِ انسان کے ایسے گرانبہا ورثہ سے محروم کرے گی، اور اس کی یہ کمی کسی اور طرح بمشکل پوری ہو سکے گی۔

سوال ۱۲:- اپنے دماغی ارتقاء کی سرگزشت بیان فرمایئے؟

جواب:- اپنے ذہنی ارتقاء کی سرگزشت کے بارے میں اس کے سوا کیا کہوں کہ سے

تفصیلِ معنیٔ غم الفت طویل ہے
اور ویسے تو خفیف سا اک دل میں درد ہے

میری پیدائش (۱۹۰۳ء) میں مشرقی پنجاب کے قصبہ بٹالہ (ضلع گورداسپور) کے ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جو شریعت اور تصوف دونوں کا گہوارہ تھا۔ میرے دادا حنفی مسلک کے ایک ممتاز عالم اور چشتیہ نظامیہ خانوادہ سے متعلق اکابر صوفیہ میں سے تھے۔ میری تعلیم و تربیت بھی انہی کے آغوش میں ہوئی اور انہی کے زیر نگرانی میں نے سلوک کی منازل بھی سرعت سے طے کیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مجھے نسبتاً چھوٹی عمر ہی میں ان دونوں میدانوں میں بہرہ وافر حاصل ہو گیا۔ بٹالہ ویسے بھی ایک مذہبی شہر تھا، اس لئے (اس دور کی عام فضا کے مطابق) وہاں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے علاوہ آریوں عیسائیوں اور قادیانیوں سے اکثر مناظرے رہا کرتے تھے۔ اس طرح مجھے فرقوں اور مذہبوں کے تقابلی مطالعہ کا بھی موقعہ مل گیا۔ بعد میں مختلف فرقوں کے باہمی مباحثوں یا آریوں اور عیسائیوں کے ساتھ مناظروں کا دور تو ختم ہو گیا لیکن ختم نبوت کے موضوع پر میں مسلسل لکھتا چلا آ رہا ہوں کہ میرے نزدیک انکار ختم نبوت کا فتنہ امت کے لئے بڑا خطرناک ہے۔ چونکہ میں اس مسئلہ پر قرآن خالص کی روشنی میں گفتگو کرتا ہوں، روایات میں نہیں الجھتا، اس لئے فریق مقابل کے پاس میرے دلائل کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ (بہرحال میں اپنے ذہنی ارتقاء کی سرگزشت بیان کر رہا تھا) میں نے طبیعت کچھ ایسی پائی تھی۔ کہ جب تک کسی معاملہ میں ذاتی طور پر مطمئن نہیں ہو جاتا تھا، وہ دل کی گہرائیوں میں نہیں اترتی تھی، چنانچہ جب ذرا شعور ابھرا اور اسی افتادِ طبیعت کے تقاضے سے اپنے طے شدہ راستے پر تنقیدی نگاہ ڈالی تو شکوک و شبہات ابھر ابھر کر سامنے آنے لگے۔ یہ وقت میرے لئے بڑا کرب و اذیت کا تھا۔ جس (موہوم) جنت میں اس وقت تک مطمئن چلا آ رہا تھا وہ چھنتی جا رہی تھی اور اس کی جگہ اطمینان اور سکون کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ میرے ایمان کی کشتی ریب و تشکیک کے ان طوفانوں میں ڈوب جاتی اگر ایک محکم لنگر اس کا سہارا نہ بنتا۔ یہ لنگر تھا حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس (اعظم) سے میری والہانہ عقیدت۔ روایات و تفاسیر کی رُو سے جو قرآن سامنے آتا تھا اس کے متعلق ذہن یہاں تک پہنچ جاتا تھا کہ یہ خدا کا کلام تو ایک طرف کسی بلند انسانی فکر کی تخلیق بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن اسوقت یہ خیال میرا دامن تھام لیتا تھا کہ جب اس قدر بلند اور پاکیزہ سیرت کی حامل ہستیؐ یہ کہہ رہی ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے، اس میں اور تو اور خود میری فکر کا بھی کوئی دخل نہیں تو اس باب میں مجھے کسی آخری نتیجہ تک پہنچنے میں عجلت سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ اس مقام پر فکرِ اقبالؒ نے میری راہنمائی کی اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جس چیز کو وہ اسلام کے خلاف "عجمی سازش" قرار دیتے ہیں،

مجھے اس کا سراغ لگانا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے کئی برس اس تحقیق میں گزارے کہ جن عناصر کے مجموعہ کا نام مروّجہ اسلام ہے، اُن کا سرچشمہ کیا ہے اور وہ کس طرح اسلام کا جزو بن گئے ہیں۔ لِلّٰہِ الْحَمْدُ کہ میری یہ خانہ لگانی بامُراد ثابت ہوئی اور میں نے علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لیا کہ ہمارا مروجہ اسلام حقیقی اسلام نہیں۔ یہ میری منزل کا حصّہ تھا۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر یہ اسلام نہیں تو پھر اسلام ہے کیا۔؟ اس سوال کا جواب بھی مجھے پھر اقبال ہی کے ہاں سے ملا کہ اسلام کا سرچشمہ قرآن ہے اور قرآن کے سمجھنے کا طریقہ (انہی کے الفاظ میں) "محاورۂ عرب اور تصریف آیات" ہے۔ چنانچہ میں نے اس طریق سے قرآن کریم کے سمجھنے کی کوشش کی تو سب سے پہلے اس کے الفاظ کا مفہوم اسی نہج سے متعین کیا جو میری "لغات القرآن" کے اندر محفوظ ہے۔ پھر تصریف آیات کا سوال سامنے آیا۔ تصریف آیات سے مفہوم یہ ہے کہ کسی ایک موضوع کے متعلق قرآن کریم میں جو کچھ آیا ہے، اُسے یکجا اپنے سامنے رکھ جائے اور پھر اُن آیات کے الفاظ کے صحیح مفہوم اور سیاق و سباق کے مطابق یہ دیکھا جائے کہ قرآن اس موضوع کے متعلق کیا راہنمائی دیتا ہے۔ قرآن ایک بھرتا پیدا کنار ہے اور میں گذشتہ قریب تیس سال سے مسلسل اور متواتر اپنا وقت اور توانائی اسی میں صرف کر رہا ہوں اور اب علیٰ وجہ البصیرت، پورے حتم و یقین کے ساتھ پکار کر کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتاب عظیم بلاشک و شبہ خدا کا کلام ہے اور پوری نوعِ انسان کے لئے مکمل اور غیر متبدّل ضابطۂ حیات۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو میں گویا ایک ایسا مسلم ہوں جو علیٰ وجہ البصیرت ایمان لایا ہوں۔

قرآن کریم اور اُس کی روشنی میں حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے خصائص کبریٰ کو سمجھ لینے کے بعد مجھ پر یہ فریضہ عائد ہوا کہ ــــ دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دوں ــــ میری تمام تصانیف، جن میں لغات کے علاوہ، پورے کے پورے قرآن کا مفہوم، اور معراج انسانیت بھی شامل ہے۔ نیز میرے مضامین، میری تقریریں، میرا درسِ قرآن سب اسی فریضہ کی ادائیگی کے عملی مظاہر ہیں۔ میرا سر نیاز بدرگاہ رب العزت قدم قدم پر سجدہ ریز ہے کہ اُس نے میری اس سعی ناتمام کو شرفِ قبولیت سے نواز ہے اور چونکہ میرا اوّلین مخاطب طبقہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ہے اس لئے اس کا ایک کثیر گروہ اسلام کا گرویدہ ہو رہا ہے۔

یہ ہے میری زندگی اور یہ ہے میرے ذہنی ارتقاء کی سمٹی ہوئی تفصیل۔ میں نے نہ کوئی سیاسی پارٹی بنائی ہے نہ ہی کسی مذہبی فرقہ کی بنیاد ڈالی ہے کہ فرقہ بندی قرآن کی رُو سے شرک ہے۔ میں علیٰ حد وسعت ارکانِ اسلام کی تعمیل دوسرے مسلمانوں کی طرح ہی کرتا ہوں اور بار بار اس کا اعلان کرتا ہوں کہ کسی فرد کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی کرے یا کوئی نیا طریقہ ایجاد کرے۔ میں عملی سیاسیات میں بھی حصّہ نہیں لیتا۔ قوم کے سامنے جو سوال آتا ہے، قرآن کریم اور سیرتِ طیبہ کی روشنی میں اس کا جائزہ لیتا ہوں ــــ اور جو کچھ مجھے وہاں سے ملتا ہے اُسے بلا کم و کاست اور بلا لحاظ لومۃ لائم قوم کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ میں زیادہ سے زیادہ اپنی فکر کے نتیجے کو سہو و خطا سے منزہ سمجھتا ہوں، نہ اس پر اصرار کرتا ہوں کہ اُسے ضرور قبول یا اختیار کیا جائے۔ میری زندگی کا مشن قرآنی فکر کا عام کرنا ہے۔ دعا ہے کہ زندگی کا جو حصّہ ابھی باقی ہے، وہ بھی اسی نہج پر گزر جائے۔

والسلام

حقائق و عبر

علماء کا وقار کیوں باقی نہیں رہا

مولوی صاحبان کو عام شکایت ہے کہ معاشرہ میں ان کا احترام باقی نہیں رہا۔ سہل انگاری یا فریب نفس کے لئے وہ نہایت بے اعتنائی سے کہہ دیتے ہیں کہ اس کی وجہ مغرب کی مادہ پرستی ہے۔ مغرب زدہ نوجوانوں کے دل میں مذہب کا احترام نہیں رہا اس لئے علماء کا احترام بھی باقی نہیں رہا۔ یعنی بجائے اس کے کہ وہ یہ سوچنے کی زحمت گوارہ کریں کہ اس میں خود ان کا کتنا قصور ہے، وہ دوسروں کو مورد الزام قرار دیکر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اگر وہ کسی وقت خالی الذہن ہو کر محاسبہ خویش کریں تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اس کے ذمہ دار وہ خود ہیں۔ وہ بالعموم اپنے کردار کو اس پستی پر لے آتے ہیں جس سے کسی کے دل میں ان کی عزت باقی نہیں رہتی۔ ہم اس کے لئے صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔

علماء کا پچھلا دور ابھی حال ہی میں گذرا ہے۔ انہیں بھی دوسروں سے اختلاف ہوتا تھا اور وہ باہمی مناظروں اور مباحثوں میں بڑی شدت اختیار کیا کرتے تھے۔ لیکن ان کی بالعموم کیفیت یہ تھی کہ وہ ایسا کرنے میں فریق مقابل کے خلاف کذب و افترا سے کام نہیں لیتے تھے۔ جو کہتے تھے وہ صداقت پر مبنی ہوتا تھا۔ اس لئے ان کے متبعین تو ایک طرف، ان کے مخالفین کے دل میں بھی ان کا احترام رہتا تھا۔ لیکن اب حالت بدل چکی ہے۔ اب، سیاسی لیڈروں کی دیکھا دیکھی۔ یا اس حقیقت سے غلط نتیجہ اخذ کر کے کہ اسلام میں دین اور سیاست میں کوئی فرق نہیں۔ انہوں نے بھی اس "فن شریف" سے بے محابا کام لینا شروع کر دیا ہے جسے پراپیگنڈہ کہتے ہیں اور جس کا کام ہی کذب و افترا سے فریق مقابل کو ذلیل و رسوا کرنا ہوتا ہے۔ اسی کی ایک تازہ مثال یہاں پیش کی جاتی ہے۔

یہ معلوم ہے کہ ان حضرات کے پراپیگنڈہ کے مستقل ہدف پرویز صاحب اور طلوع اسلام ہیں۔ دیکھئے اس باب میں یہ حضرات کہاں تک چلے جاتے ہیں۔ المنبر (لائل پور) ایک مذہبی پرچہ ہے جس کے رئیس التحریر مولانا عبدالرحیم اشرف علماء کے طبقہ میں ایک معروف شخصیت ہیں۔ اس ہفت روزہ کی ایک حالیہ اشاعت (بابت ۲۰ جولائی ۱۹۷۳ء) میں ڈاکٹر سبطین لکھنوی کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے۔ "ڈاکٹروں نے عصمت رسالت کو تار تار کر ڈالا"۔ اس میں ایک ذیلی سرخی ہے۔

پرویز کی رسالت

اس کے نیچے لکھا ہے۔

جناب پرویز صاحب اپنی تحریروں میں عموماً اپنے آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند مقام پر فائز کر کے ان تمام آیات قرآنی کو جو آنحضرت سے متعلق ہیں اپنی ذات پر منطبق فرما لیتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ یہ دعوے کس دھڑلے سے کیا گیا ہے لیکن اس کے ثبوت میں پرویز صاحب کی کسی ایک تحریر کا بھی حوالہ نہیں دیا گیا۔ "پراپیگنڈا کے فنِ شریف" میں اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی!

اس مقالہ کی دوسری ذیلی سرخی ہے:

رسالت کے بارے میں پرویزی عقائد

اس کے تابع ذیلی کی عبارت درج ہے۔

قرآن مجید نے رسول کا لفظ کئی مقامات پر محض اس کے لغوی معنوں میں (قاصد یا پیغام رساں کے معنوں میں بھی) استعمال کیا ہے۔ ان لغوی معنوں میں ہر وہ شخص خدا کا رسول یعنی "پیغام رساں" کہلا سکتا ہے جو خدا کے کسی پیغام کو (یعنی جو پیغام کسی نبی کی کتاب میں درج ہوا ہے) اسے دوسروں تک پہنچائے ۔۔۔ ان کے معانی کی رو سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ نبی اکرمؐ کو خاتم النبیین کیوں کہا جاتا ہے، خاتم الرسل یا خاتم المرسلین کیوں نہیں کہا گیا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ خدا کیطرف سے کتاب کا ملنا تو اب ختم ہو گیا ہے لیکن خدا کی طرف سے ملی ہوئی کتاب (قرآن کریم) کو دوسروں تک پہنچانے کا فریضہ جاری ہے۔ یہ اُمت کی ذمہ داری ہے اور جو اس فریضہ کو انجام دیتا ہے وہ مصطلح معانی میں نہیں (بلکہ لغوی معانی میں) خدا کا رسول" یعنی اس کے پیغامات کو دوسروں تک پہنچانے والا کہلا سکتا ہے (طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۵۸ء)

طلوعِ اسلام کا یہ فلسفہ کہ رسول اللہ بمعنی پیغام رساں ہر اُس شخص کا نام ہو سکتا ہے جو پیغامات خداوندی کو دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری قبول کرلے، دنیا بھر کے بوالہوسوں کو رسول اللہ بننے کا شوق دلانے میں انتہائی کامیاب ثابت ہوا۔

آپ کو معلوم ہے کہ بات کیا تھی اور اسے کسطرح پیش کیا گیا ہے؟ غور سے سنئے۔

پرویز صاحب، اور ان کی قرآنی فکر شائع کرنے والا مجلہ طلوعِ اسلام، منکرینِ ختمِ نبوت کے خلاف مسلسل مصروفِ جہاد ہیں — پرویز صاحب نے تو طلوعِ اسلام کی اشاعت سے بھی پہلے سے یہ جہاد شروع کر رکھا ہے۔ منکرینِ ختمِ نبوت کی ایک دلیل یہ بھی ہوتی ہے کہ رسول صاحبِ شریعت ہوتا ہے اور نبی غیر تشریعی۔ رسول اللہؐ کے بعد تشریعی رسول تو نہیں آسکتا لیکن غیر تشریعی نبی آسکتا ہے۔ مرزا غلام احمد غیر تشریعی نبی تھے۔ ہمارے مولوی صاحبان کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ رسول صاحبِ کتاب ہوتا ہے۔ اور نبی کو کتاب نہیں ملتی۔ یعنی اس باب میں وہ مرزائی حضرات سے ہمنوا ہوتے ہیں۔

پرویز صاحب نے قرآنی نصوص سے ثابت کیا کہ نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ دونوں صاحبِ کتاب ہوتے ہیں اسی لئے تشریعی قرآن کریم ایک ہی مرسل من اللہ کو کبھی نبی کہہ کر پکارتا ہے اور کبھی رسول اس لئے حضور ختم الانبیاءؐ کے بعد نہ کوئی نبی آسکتا ہے، نہ رسول۔ جو شخص یہ دعوےٰ کرتا ہے کہ وہ نبی (بغیر کتاب) ہے وہ نہ صرف ختمِ نبوت کی مہر کو توڑتا ہے بلکہ قرآنی حقائق سے بھی بے بہرہ ہوتا ہے۔ مرزائی حضرات کے پاس ان کی اس دلیل کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔

جون ۱۹۵۸ء میں راولپنڈی کے ایک ماہنامہ "فیض الاسلام" میں مولانا محمد فضل قدیر ظفر ندوی صاحب کا ایک مقالہ شائع ہوا جس میں انہوں نے نبی اور رسول میں مندرجہ بالا فرق کی تائید کی۔ اس پر کوئٹہ کے حسن عباسی رضوی صاحب نے مولانا مذکور

سے خط و کتابت کی جس میں واضح کیا کہ ان کا موقف صحیح نہیں۔ قرآن کریم کی رو سے نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ خط و کتابت طلوع اسلام بابت دسمبر ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔ اس بحث میں ندوی صاحب نے اپنے موقف کی تائید میں سورہ حج کی اس آیت کا بھی ذکر کیا جس میں کہا گیا ہے کہ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ ..... (۲۲/۵۲) اس میں نبی اور رسول کے الفاظ الگ الگ آئے ہیں۔ اس آیت کے صحیح مفہوم کے سلسلہ میں طلوع اسلام نے (خط و کتابت کے بعد) اپنے استدلال میں منجملہ دیگر دلائل۔ وہ دلیل بھی دی جس کا اقتباس ڈاکٹر سبطین صاحب نے اپنے مقالہ میں درج کیا ہے اور جسے ہم نے اوپر نقل کر دیا ہے اور جس کا عنوان دیا گیا ہے ۔ رسالت کے بارے میں پرویزی عقائد۔

یہ تھا اس اقتباس کا پس منظر اور یہ ہے وہ انداز جس کے مطابق اسے پیش کیا گیا ہے۔ یعنی

۱۔ یہ تمام خط و کتابت اور طلوع اسلام کا استدلال یہ ثابت کرنے کے لئے تھی کہ نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ میرزا غلام احمد یا ان کے متبعین کا یہ دعوے کہ وہ رسول نہیں محض صاحب کتاب ہوتا ہے بلکہ نبی ہیں جو صاحب کتاب نہیں ہوتا باطل ہے اور قرآنی حقائق سے لاعلمی کی دلیل۔ لیکن المنبر میں اسے پیش کیا جا رہا ہے یہ تاثر دینے کے لئے کہ پرویز صاحب کے عقائد کی رُو سے باب رسالت کھلا ہے۔

۲۔ اقتباس میں جہاں نقطے (۔۔۔۔) دیئے ہوئے ہیں، وہاں طلوع اسلام میں جو عبارت تھی۔

ہو سکتا ہے کہ سورہ حج کی زیر نظر آیت (۲۲/۵۲) میں رسول کا لفظ لغوی معنوں میں استعمال ہوا ہو۔ اس صورت میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ایسا ہوتا رہا ہے کہ جب کسی نبی نے اپنی کتاب کو لوگوں کے سامنے پیش کیا تو شریر النفس لوگوں نے اس میں تحریف کر دی۔ یا اس کتاب کو کسی عام انسان نے دوسروں کے سامنے پیش کیا۔ تو لوگوں نے اس میں تحریف کر دی۔ مقصد اس سے یہ بتانا تھا کہ قرآن سے پیشتر کتب سماوی کے ساتھ یہ کچھ ہوتا چلا آیا تھا۔

المنبر میں شائع شدہ اقتباس میں یہ پوری عبارت حذف کر دی گئی ہے۔ اگر اسے علی حالہ رہنے دیا جاتا تو قارئین سمجھ جاتے کہ بات کیا ہو رہی ہے اسے دانستہ حذف کر دیا گیا۔

۳۔ اور سب سے آخر ایک ایسی بات جس کا کوئی دیانتدار انسان تصور تک بھی نہیں کر سکتا۔ المنبر میں شائع شدہ اقتباس کو جن الفاظ پر ختم کر کے اس کے بعد (طلوع اسلام دسمبر ۱۹۶۶ء) لکھا گیا ہے، طلوع اسلام میں ان الفاظ کے بعد یہ الفاظ بھی موجود ہیں۔

اگرچہ اس لفظ (رسول) کو اب ان معانی میں بھی استعمال نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے خواہ مخواہ الجھنیں پیدا ہونے کا امکان ہے۔

آپ اوپر (۲ میں) درج شدہ عبارت، اور ان الفاظ کو اقتباس میں رکھ کر اسے دوبارہ پڑھئے اور پھر دیکھئے کہ اس سے کیا نتیجہ مرتب ہوتا ہے اور ان کے حذف کر دینے سے کیا تاثر پیدا کیا گیا ہے۔ بالخصوص ان آخری الفاظ کے حذف کر دینے سے۔

ہم ڈاکٹر سبطین صاحب کو تو جانتے نہیں لیکن مدیر المنبر کی خدمت میں عرض کریں گے کہ آپ سوچئے کہ جب مندرجہ بالا حقیقت لوگوں کے سامنے آئے گی اور وہ دیکھیں گے کہ آپ لوگ دوسرے کے خلاف پراپیگنڈا کرنے میں کس دیانتداری سے کام لیتے ہیں تو آپ کے متعلق ان کے دل میں کیا خیال پیدا ہوگا۔ اور اس کے بعد سوچئے کہ جب قیامت میں خدا کے

حضور آپ بھی پیش ہوں گے اور وہاں پرویز صاحب بھی ہوں گے اور طلوعِ اسلام بابت دسمبر ۱۹۶۲ء کا کھلا ہوا ورق بھی، تو وہاں آپ کا کیا جواب ہوگا؟ پرویز صاحب کے خلاف اس قسم کے کذب و افترا سے آپ حضرات کو دنیا میں کیا ملتا ہے، اس سے تو ہم واقف نہیں لیکن اس سے آخرت میں آپ کو کیا ملے گا۔ اس سے تو ہر وہ شخص واقف ہو سکتا ہے جو آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ کیا آپ کو اپنی عاقبت کا اتنا بھی خیال نہیں؟

۲۔ کیا یہ طریق اسلامی ہے

لیبیا کے سربراہ کرنل قذافی کے متعلق عام اطلاعات یہ ہیں کہ وہ اسلام کا احیاء چاہتے ہیں۔ یہ خیال بڑا مبارک اور اس قسم کا اقدام بڑا مسعود ہے بشرطیکہ جس چیز کا احیاء کیا جائے وہ حقیقی اسلام ہو۔ ان کے ان اقدامات کے سلسلے میں اخبارات میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

> لیبیا میں اسلامی ثقافتی انقلاب کی تحریک جاری ہے۔ صحافیوں اور دانشوروں کے ایک ہجوم نے کل لیبیا کی قومی خبر رساں ایجنسی کی عمارت پر قبضہ کر کے اس کا نام عرب انقلابی خبر رساں ایجنسی رکھ دیا۔ عوام کو ایک نعرہ دیا گیا ہے کہ "سب غیر اسلامی کتابیں جلا دو"۔ چنانچہ اشتراکی اور سامراجی ادب خصوصاً کارل مارکس کی کتاب "سرمایہ" اور فرانسیسی ادیب پال سارترے کی تصنیفات بھی جلا دی گئیں۔ (امروز۔ ۲۱ رجون ۱۹۷۳ء)

اس میں شبہ نہیں کہ اگر کسی مملکت میں ایسا لٹریچر موجود ہے جسے وہ نامناسب خیال کرتی ہے۔ تو اسے حق حاصل ہوتا ہے کہ اس کی اشاعت ممنوع قرار دے دے اور شائع شدہ لٹریچر اپنے قبضہ میں لے لے۔ لیکن اس کے لئے جو طریق کار مندرجہ بالا خبر میں بتایا گیا ہے اسے تو کسی صورت میں بھی مناسب نہیں خیال کیا جا سکتا، چہ جائیکہ اسے "اسلامی" کہا جا سکے۔ "عوام سے یہ کہہ دینا کہ "سب غیر اسلامی کتابیں جلا دو" جس قسم کی فوضویت (انارکی) پیدا کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے۔ ہمارے ہاں مصیبت یہ ہے کہ اشتراکی ممالک کو تو چھوڑیئے، جو ممالک اسلامی انقلاب لانے کے مدعی ہیں، وہ بھی اس کے لئے وہی طریقے اختیار کرتے ہیں جو اشترکیین کے ہاں رائج ہیں۔ اشترکیوں کے ہاں تو جائز اور ناجائز کا کوئی مستقل معیار نہیں۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ جو ذریعہ بھی حصولِ مقصد کے لئے مفید ہو وہ جائز ہے۔ لیکن اسلام تو ذریعہ اور مقصد میں فرق نہیں کرتا۔ اسکی رو سے جائز مقصد کے حصول کے لئے ذرائع بھی جائز ہی اختیار کئے جا سکتے ہیں۔

لیکن اس کا کیا علاج کہ ہمارے ہاں کے "ماڈرن مدعیانِ انقلاب اسلام" بھی مقصد کے حصول کے لئے ہر قسم کا حربہ استعمال کر لینا جائز سمجھتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس قسم کی مدعیِ انقلابِ اسلام، جماعتِ اسلامی ہے۔ ایک دفعہ سکھر کے کارکنانِ جماعت اسلامی کے اجتماع میں ایک صاحب نے مودودی صاحب سے سوال کیا کہ:

> ہمارے ہاں ایسے قوانین پائے جاتے ہیں جو صریحاً خلاف شریعت ہیں۔ کیا ایسے قوانین کی اطاعت، طاغوت کی اطاعت نہیں۔

سوال بڑا متعین اور براہ راست تھا۔ مودودی صاحب اس کا جواب تو گول کر گئے لیکن ارشاد یہ فرمایا:

> ایک شخص کے شعور کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ اپنے آپ کو ایک گندے پانی کے تالاب میں پاتا ہے۔ وہ اس تالاب سے نکلنے کی کوشش کریگا۔ تو اسے لامحالہ اسی گندے پانی میں ہاتھ پاؤں مارنا ہوں گے۔ اب اگر وہ یہ

شرط لگا دے کہ پاکیزہ پانی ہو گا تو ہاتھ ماروں گا ورنہ نہیں، تو وہ اس گندگی سے کبھی نہیں نکل سکے گا۔

اسی طرح اگر ایک شخص یہ شرط لگا دے کہ اس نظام کو تبدیل کرنے کے لئے وہ صرف خالص اسلامی قوانین ہی سے کام لے گا تو وہ تبدیلی کا یہ کام کر ہی نہیں سکتا۔ (ایشیا ۲۸ ۷/۴۸)

یعنی مودودی صاحب کے اس فتویٰ کی رُو سے غیر اسلامی نظام کو بدلنے کے لئے غیر اسلامی طریقے بھی اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی قسم کے کوئی "مجتہد" حکومت لیبیا کے بھی مشیر ہیں جو بجائے اس کے کہ اسلام پر نگاہ رکھنے والے اہلِ علم اربابِ دانش و بینش کی ایک کمیٹی کے سپرد یہ کام کریں کہ وہ وہاں کے لٹریچر کا جائزہ لیکر، اس کی چھان پھٹک کریں وہ عوام کو یہ نعرہ دیتے ہیں کہ جاؤ، سب غیر اسلامی کتابیں جلا دو۔ دشمنانِ اسلام آج تک یہ اعتراض کرتے چلے آ رہے ہیں کہ عہدِ فاروقی میں، مسلمانوں کی فوجوں نے اسکندریہ کی لائبریری جلا دی تھی اور ہم اس الزام کی تردید میں دلائل و شواہد پیش کرتے ہیں۔ معلوم نہیں دورِ حاضر کے اس قسم کے "اسلامی اقدامات" کے متعلق ہم کیا کہیں گے؟

واضح رہے کہ جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے، ہم کرنل قذافی اور حکومت لیبیا کے اس فیصلہ پر کہ مملکت میں اسلام کا احیاء کیا جائے، انہیں مستحق تبریک و تحسین قرار دیتے ہیں۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس سلسلہ میں جو (مبینہ) طریقِ کار اختیار کیا جا رہا ہے وہ صحیح نہیں۔ عوام کو اس قسم کے اختیارات نہیں دینے چاہئیں — ہر کارے و ہر مردے۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

عمر رسیدگی کا ایک المیہ یہ بھی ہوتا ہے کہ رفقائے قدیم میں سے اکثر داغِ مفارقت دیتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح زندہ رہنے والے کی تنہائی بڑھتی جاتی ہے۔ میرے اس طرح چھوڑ کر جانے والے رفقاء کی فہرست میں حال ہی میں ایک کا اور اضافہ ہوا ہے۔ تحریکِ طلوعِ اسلام کی نمود ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی لیکن میں ذہن پر زور دینے کے باوجود متعین نہیں کر سکا کہ مرزا محمد جمیل اس کے ساتھ کب وابستہ ہوئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ پہلے دن ہی سے میرے ساتھ تھے اور آخری سانس تک ساتھ رہے۔ جذبۂ خدمت سے سرشار، ایثار کا مجسمہ اور خلوص کا پیکر، ایک خلوص فوارہ کی طرح گرم جوش ہوتا ہے۔ ایک چٹان کی طرح خاموش۔ ان کا خلوص ٹھوس اور خاموش تھا۔ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف، لبوں پر تبسم، لیکن خاموش۔ اس پر استغنا کا یہ عالم کہ تحریک میں ایک "سپاہی" سے ہٹ کے کوئی مقام ان کی نگاہوں میں کبھی جچا ہی نہیں۔ پچھلے چند برسوں سے نجی ضروریات کے ماتحت کراچی اور لاہور دونوں جگہ ان کا آنا جانا رہتا تھا۔ اس دفعہ لاہور سے کراچی جاتے، سکھر اتر گئے کہ اپنی بیٹی سے ملتے جائیں۔ وہاں پہنچتے ہی یکایک دل کا دورہ پڑا اور ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گئے۔ حادثہ کی اس اچانک خبر سے کراچی اور لاہور کی بزموں اور خود ادارہ میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

مرزا جمیل میرے قدیم ترین رفیق اور ادارہ کے ناظم مرزا محمد خلیل صاحب کے برادرِ بزرگ تھے۔ ابھی چند ماہ ہوئے خلیل صاحب کی رفیقۂ حیات کا انتقال ہو گیا تھا۔ اب ایسے جاں نثار بھائی جدا ہو گئے۔ بیوی کی وفات سے ان کا گھر اجڑ گیا۔ بھائی کی وفات سے کمر ٹوٹ گئی اور ایک مخلص کارکن کی کمی سے ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھ گیا۔ میں اور جملہ وابستگانِ تحریک، محترم خلیل صاحب اور مرحوم کے دیگر متعلقین کیساتھ ان کے اس صدمہ میں برابر کے شریکِ غم ہوتے ہوئے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں صبرِ جمیل اور مرحوم کو حسنِ مآب مرحمت فرمائے۔

جگر فگار
پرویزؔ

مفسدین کا انجام صفحہ "۳۲" سے آگے مسلسل

اے میری قوم کے لوگو! اپنے معاشی نظام کی بنیاد عدل و انصاف پر رکھو اور کسی کے حق میں کمی نہ کرو۔ ایسا کرو گے تو ملک میں سخت ناہمواریاں (فساد) پیدا ہو جائیں گے اور معاشرہ تہس نہس ہو جائے گا۔

یاد رکھو! جو کچھ تم اس طرح فریب کاری اور سلب و نہب سے اکٹھا کر لیتے ہو، اگرچہ وہ بظاہر بہت کچھ نظر آتا ہے لیکن وہ تمہارے لئے فی الحقیقت نفع بخش نہیں ہو سکتا۔ ثبات و دوام صرف ان مفادات کے لئے ہے جو قوانین خداوندی کے مطابق حاصل کئے جائیں ـــــ اور خدا کا قانون یہ ہے کہ ثبات و دوام اُسے حاصل ہو سکتا ہے۔ جو نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔ لیکن یہ بات تمہاری سمجھ میں اس وقت آ سکتی ہے جب تم خدا کے قانون کی صداقت کو تسلیم کر لو۔ اگر تم اسے تسلیم نہیں کرتے، تو تم سے اسے جبراً نہیں منوایا جا سکتا۔ میرا کام تم تک اس پیغام کو پہنچا دینا تھا۔ میں تم پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ تم سے جبراً یہ کچھ منواؤں۔

(مفہوم القرآن ـــــ $\frac{11}{85-86}$)

ہم سمجھتے ہیں کہ اس باب میں اس سے زیادہ اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جب تک قوم۔ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں لاتی ـــــ یعنے اسے ایک حقیقت کے طور پر تسلیم نہیں کرتی ـــــ اس کی حالت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی ـــــ اور جب تک یہ اپنی موجودہ روش میں تبدیلی پیدا نہیں کرتی، یہ تباہی سے بچ نہیں سکتی۔ یہ خدا کا قانون ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔

اور خدا کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

خدا اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

غیر مستطیع حضرات کیلئے ایک خصوصی پیشکش

ہمارے پاس اکثر ایسے احباب کے خطوط آتے رہتے ہیں جو ماہنامہ طلوعِ اسلام کا باقاعدہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں لیکن ان میں اتنی استطاعت نہیں ہوتی کہ دس روپے چندہ ادا کر سکیں۔ قرآنی فکر سے وابستہ ایک مخیر دوست نے یہ پیشکش کی ہے کہ اگر ایسے غیر مستطیع شائقین نصف چندہ (یعنی پانچ روپے) ادا کر دیں تو وہ بقایا پانچ روپے اپنی طرف سے ادا کر دیں گے اور لیں اُن کے نام سال بھر کے لئے طلوعِ اسلام جاری ہو جائے گا۔ سرکاری اور دینی درسگاہوں کے طلباء، نیز ائمہ مساجد و اساتذہ حضرات کو ترجیح دی جائے گی۔ اس رعایت سے فائدہ اٹھانے والے حضرات پانچ روپے بذریعہ منی آرڈر ہمیں بھیج دیں۔ رسالہ اُن کے نام سال بھر کے لئے جاری کر دیا جائے گا۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

INSURE »——————— with

Sterling Insurance Coy. Ltd.

TRANSACTS MOTOR, FIRE MARINE
& MISC: INSURANCES

BRANCHES ALL OVER PAKISTAN

HEAD OFFICE:
20, Shahrah-e Quaid-e-Azam
P.O. Box No. 119 LAHORE
Telephone No. 54245

KARACHI OFFICE:
503-504, Muhammadi House
11, Chundrigar Road, KARACHI
Telephone Nos. 231971, 224525

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ
إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ
جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

O ye who believe! Fear God as He should be feared.
and die not except in a state of Islam. And hold fast,
all together, by the Rope which God stretches out
for you. and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO
INDUSTRIES LIMITED

انڈیا کیساتھ ہمارے تعلقات

ہمارے ہاں آئے دن یہ مطالبہ اٹھتا رہتا ہے کہ ہمیں ہندوستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات وابستہ کرنے اور رکھنے چاہییں۔ اس مطالبہ کی پشت پر وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ اس کے لئے وہ کبھی خود براہ راست سامنے آ جاتے ہیں اور اکثر اس کے لئے ریشہ دوانیاں کرتے رہتے ہیں۔ جن نامساعد حالات میں سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اب یہاں تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ بھارت اور پاکستان میں کانفیڈریشن تک کی تجاویز پیش کرنے لگ گئے ہیں۔

آج سے ٹھیک بیس سال پہلے جب یہاں اسی قسم کے جذبات ابھارے گئے تھے، ہم نے (طلوع اسلام بابت ستمبر ۱۹۵۳ء کے لمعات میں) یہ اصولی بحث کی تھی کہ قرآن کریم کی رو سے، مسلمانوں کے غیر مسلموں کے ساتھ کس قسم کے تعلقات رہ سکتے ہیں۔ اس وقت مسئلہ کشمیر اور دریاؤں کے پانیوں کی تقسیم کا تنازعہ اہمیت اختیار کر رہا تھا اور پنڈت جواہر لعل نہرو (آنجہانی) آستین میں خنجر چھپائے ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے تھے۔ آج حالات اس سے بھی نازک ہو چکے ہیں اور اس دوران میں ہندوؤں نے جو کچھ ہمارے ساتھ کیا ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ اس سلسلے میں پرویز صاحب کا خطاب ہندو کیا ہے۔ قابل ملاحظہ ہے جو طلوع اسلام میں شائع ہو چکا ہے اور ایک پمفلٹ کی شکل میں بھی) ان دنوں حالات ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ جو کچھ اس زمانے میں لکھا گیا تھا اسے ہم دوبارہ قوم کے سامنے پیش کر دیں۔ یہ اس لئے بھی کہ جو کچھ ہم نے اس وقت لکھا تھا وہ (ہمارے مستقل مسلک کے مطابق) قرآن کریم کے حقائق پر مبنی تھا اور قرآنی حقائق نہ کبھی پرانے ہو سکتے ہیں نہ قابل تغیر و تبدل۔ وہ حقائق ابدی اور تغیر نا آشنا ہیں اور انسانی راہ نمائی کے لئے زندہ جاوید۔

دیکھئے، ہم نے اس زمانے میں کیا لکھا تھا!

جیسا کہ ہم کئی بار لکھ چکے ہیں، مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ یہ معاملات کے فیصلے عقل و خرد اور فکر و تدبر کی بجائے جذبات کی رو سے کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ ذرا تاؤ میں آئے تو خواہ مخواہ مکا دکھا دیا اور اس کے برعکس کسی نے دو میٹھی چکنی چپڑی باتیں کیں اور یہ بچھ گئے۔ ظاہر ہے کہ دنیا کے معاملات (بالخصوص بساط سیاست) میں اس روش کی حامل قوم، قدم قدم پر پٹ جاتی ہے۔ ویسے تو مسلمانان پاکستان کی زود فراموشیوں کے کئی منظر اس قلیل سی مدت میں دیدہ بینا کے سامنے آ چکے ہیں لیکن گذشتہ ماہ، بھارت ورش کے مہا منتری پنڈت جواہر لال جی نہرو کے پاکستان تشریف لانے پر اس کا مظاہرہ جس وسعت

اور شدت سے ہوا۔ اس کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ ان کی آمد پر قوم کی طرف سے جن جذبات کا اظہار ہوا۔ ان سے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ان کے نزدیک وہ مسیحا آپہنچا ہے جس کے ہاتھ میں ان کے تمام دکھوں کا مداوا اور ان کی تمام مصیبتوں کا حل ہے ہر ایک یوں سمجھے بیٹھا تھا کہ نہرو جی پورے کا پورا کشمیر ان کے حوالے کر دیں گے۔ تمام دریاؤں کا رُخ پاکستان کی طرف موڑ دیں گے۔ تاکہ یہاں آب پاشی کیلئے پانی کی قلت نہ رہے۔ پاکستان اور ہندوستان کی سرحد پر سے اپنی چھاؤنیاں اٹھالیں گے۔ جو کچھ آج تک چور دروازوں کے راستے ہندوستان جاتا رہا ہے اس کی روک تھام کر دیں گے۔ ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجرین کی تمام جائیدادوں کی قیمت نقد ادا کر دیں گے اور جائیدادوں کے علاوہ یہ لوگ جو کچھ وہاں چھوڑ آئے ہیں وہ سب کچھ یہاں پہنچا دیں گے۔ یہ کچھ عوام تک ہی محدود نہ تھا بلکہ ہمارے ارباب سیاست تک بھی اسی فریب میں مبتلا تھے۔ کہ اب پاکستان اور ہندوستان کے متنازعہ فیہ امور کی تمام گتھیاں سلجھ جائیں گی۔ ہم یہ کچھ دیکھ رہے تھے اور محو حیرت تھے کہ یا اللہ! یہ قوم بھی کسقدر سادہ اور بھولی واقع ہوئی ہے باعث غنیمت ہوا کہ یہ فریب زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہا۔ نہرو جی نے یہاں کے احوال کو الف کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا اور اس کے بعد نہایت اطمینان سے کشمیر میں وہ کچھ کر دیا جس سے مسلمانانِ عالم کے گھروں میں صف ماتم بچھ گئی۔ جس وقت یہ سطور لکھی جارہی ہیں، پاکستان کے وزیراعظم مسئلہ کشمیر کے متعلق ہندوستان کے وزیراعظم کے ساتھ گفتگوئے مصالحت میں مصروف ہیں۔ ہم پیشن گوئی تو نہیں کرنا چاہتے کہ ان مذاکرات کا آخری نتیجہ کیا ہوگا۔ لیکن اس دوران میں ہم اتنا بتا دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں، کہ غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کے بارہ میں ہمیں قرآن نے کیا راہنمائی دی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن تمام نوع انسانی کے ساتھ عدل و انصاف کی تاکید کرتا ہے لیکن وہ انسانوں کے مختلف گروہوں کے فرق کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ کھلے کھلے الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ ظالم اور مظلوم میں نمایاں فرق ہے۔ اگر تمہیں مظلوم کے ساتھ ہمدردی ہے تو تم ظالم کے ساتھ دوستی کے تعلقات قائم نہیں رکھ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ حق و باطل، کفر و ایمان، نور و ظلمت اور فساد و صالحیت کے اعتبار سے دنیا میں دو بالکل متضاد اور باہم گروہ مخالف گروہ چلے آئے ہیں۔ دنیا میں جب اور جہاں کہیں حق اور باطل کا معرکہ گرم ہوتا ہے تو یہی دو گروہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہوتے ہیں۔ وہ حق و صداقت کے حامیوں کو حزب اللہ یا جماعت مومنین کہہ کر پکارتا ہے اور ان کے فریق مقابل کو حزب الشیطان یا کفار کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مومن، مومن کا دوست ہوتا ہے۔ (والمؤمنون والمؤمنات بعضھم اولیاء بعض ۹/۷۱) اور کافر، کافر کا دوست ہوتا ہے (والذین کفروا بعضھم اولیاء بعض ۸/۷۳) اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بتا دیا ہے کہ کفار کا گروہ ہمیشہ تمہارا مخالف اور دشمن رہے گا (ان الکافرین کانوا لکم عدوا مبینا ۴/۱۰۱)

جو لوگ ایمان والے ہیں انہیں کبھی ایسا نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ کفار سے دوستی کے تعلقات پیدا کریں۔ جس کسی نے ایسا کیا تو وہ یاد رکھے کہ اس کا اللہ کے ساتھ کوئی سروکار نہیں رہا۔ تمہیں چاہیئے کہ کفار کی طرف سے اپنی حفاظت کا پورا پورا انتظام رکھو (۴/۱۴۴)

دوسری جگہ ہے:۔

اے ایمان والو! اپنوں کے سوا کسی اور کو اپنا ہمراز اور معتمد نہ بناؤ۔ یہ لوگ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ وہ ہمیشہ تمہاری ضرر رسانی کی تمنا رکھتے ہیں۔ بعض منصوبے تو ان کے منہ سے ظاہر ہو جاتے ہیں لیکن جس قدر ان کے دل میں چھپا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ ..... اگر کبھی تمہارے بھلے کی کوئی بات ہو جائے تو وہ

ان کے لئے غم کا موجب بن جاتی ہے اور اگر تم پر کوئی مصیبت آ جائے تو یہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر تم ثابت قدم رہو اور ان کی طرف سے اپنی حفاظت کرتے رہو تو پھر ان لوگوں کی تدبیریں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ (۳/۱۱۹-۱۲۰)

غیروں کے علاوہ اس نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ

اگر تمہارے باپ اور بھائی بھی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو عزیز رکھیں تو انہیں اپنا دوست نہ بناؤ۔ جو کوئی ان سے دوستی کے تعلقات قائم کرے گا تو یاد رکھو اس کا شمار بھی انہی میں ہو جائے گا۔ (۹/۲۳)

سورۂ مجادلہ میں ہے کہ

تم کبھی ایسا نہ دیکھو گے کہ وہ لوگ جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں ان لوگوں سے دوستی کے تعلقات قائم کرنے لگیں جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں خواہ وہ ان کے اپنے باپ اپنے بھائی اور اپنے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں (۵۸/۲۲)

اتنا ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کے متعلق بھی جو دین خداوندی کی تضحیک کرتے ہوں صاف صاف کہہ دیا کہ انہیں بھی کبھی اپنا دوست نہ بناؤ (۵/۵۷) یہ قرآن کریم کے صریح احکام ہیں جن کے لئے نہ کسی تفسیر کی ضرورت ہے نہ تشریح کی۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے انسانی تعلقات کی بنیاد ہی جداگانہ تجویز کی ہے۔ وہ ان تعلقات کو تصورِ حیات (Ideology) کی بنیادوں پر استوار کرتا ہے اس کے نزدیک دنیا کے تمام انسان خواہ وہ کسی قوم، کسی نسل، اور کسی خطہ کے ہوں۔ (Ideology) کے اشتراک کی بنیاد پر ایک ملت بن جاتے ہیں۔ اور جو لوگ اس (Ideology) کے مخالف ہوں وہ ان کے مخالفین قرار پاتے ہیں۔ وہ جماعتِ مخالف کے ساتھ عدل و انصاف کے برتاؤ کا تو حکم دیتا ہے لیکن ان سے اعتماد، بھروسہ، رازداری اور دوستداری کے تعلقات سے بڑی شدت سے روکتا ہے۔ اسلئے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ جو قوم آپ کی (Ideology) کی مخالف ہو وہ آپ کی بہبودی اور خوشحالی کی آرزومند ہو۔ جیسا کہ قرآن نے کہا ہے وہ تمہاری مصیبتوں سے خوش ہوں گی۔ اور تمہاری راحتیں ان کے لئے سوہانِ روح بن جائیں گی۔ اسلئے یہ ناممکن ہے کہ وہ کسی ایسی اسکیم یا تدبیر کی تائید کریں جو آپ کے لئے نفع مند ہو۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم میں اسلام کی کوئی بات باقی نہیں رہی لیکن اسلام سے خالی نسبت بھی ہمارا اتنا بڑا جرم ہے جس کی بنا پر دنیا کا کوئی غیر مسلم کبھی ہمارا خیرخواہ نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں کی تیرہ سو سال کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے ہندوؤں کی طرف سے جو برتاؤ ہمارے ساتھ ہوتا رہا وہ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جو کچھ ان کی طرف سے ہوتا چلا آ رہا ہے اسے اندھوں نے بھی دیکھا اور بہروں نے بھی سنا ہے۔ آپ اس چوبیس سالہ زندگی پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ آپ کو اس ہمسایہ قوم میں شرفِ انسانیت کی کوئی جھلک بھی دکھائی دی ہے؟ اس کے برعکس وعدہ خلافی، دروغ بافی، کذب تراشی، افترا پردازی کی کوئی شق بھی ایسی ہے جسے انہوں نے آپ کے خلاف اختیار نہ کیا ہو؟ دراز دستی، سلب و نہب، لوٹ کھسوٹ کی کوئی نہج ایسی ہے جس کا مظاہرہ ان کی طرف سے نہ ہو چکا ہو؟ معاہدات شکنی، بین الاقوامی قوانین سے سرکشی، حقوقِ ہمسائیگی کی حدود فراموشی، فیصل شدہ معاملات کی خلاف ورزی کی کوئی صنف ایسی ہے جو ان کی طرف سے عمل میں نہ لائی جا چکی ہو؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قتل و غارت گری تباہی اور بربادی، ظلم و عداوت، اور نخوت، رعونت، مسلم کشی اور انسانیت سوزی کی کوئی داستان ایسی ہے جو ان کے سیاہ کارناموں کے سامنے ماند نہ پڑ چکی ہو؟ یہ اس لئے کہ خود حکومتِ ہندوستان کے وزیر تعلیم، ابوالکلام صاحب آزاد کے الفاظ میں (جو انہوں نے اس زمانے میں لکھے تھے جب ان کی حق گوئی پر سیاسی مصلحتوں کا پردہ نہیں پڑا تھا۔)

کفار، واقعات کو جھٹلاتے ہیں، حقیقت حال کو جھٹلاتے ہیں، اصلیت کو چھپاتے ہیں، ماجرائے وقوع کو غلط بتاتے ہیں، نقص امن کرتے ہیں اور اسے جان بخشی دکھاتے ہیں۔ بات کچھ اور ہوتی ہے مگر اپنی بات کی پچ میں پبلک کو کچھ اور جتاتے ہیں ان کے عہد و پیمان کا تمہیں بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ آبرو باختہ ہیں، حرمت نفس اور شرف ذات کا انہیں لحاظ تک نہیں قسمیں کھاتے ہیں کہ یہ وعدہ استوار ہے، اس میں دوام و استمرار ہے۔ یہ عہد محکم ہے، یہ قول و اقرار قانونی حیثیت رکھتا ہے، زبانی سب کچھ کہتے ہیں اور ہاتھ سے کام لیتے وقت کچھ بھی یاد نہیں رکھتے۔ اسلام اپنے فرزندوں کو پکار پکار کر کہتا ہے کہ خبردار یہ قسمیں کھانے والے ذلیل ہیں، ان کے حلف پر نہ جانا، یہ ادھر کی بات اُدھر لگاتے ہیں، منع خیر کے لئے نہایت مبالغہ کے ساتھ آمادہ رہتے ہیں۔ تعدی ان کا شیوہ ہے۔ تطاول ان کی عادت ہے۔ سرکشی ان کی خو ہے۔ پاس عزت نہ رکھتے، ناموس کی نگہداشت نہ ضروری سمجھنے کی وجہ سے ان کی تو اصل تک محفوظ نہیں۔

(الہلال بابت ۲۷ اگست ۱۹۱۳ء)

یہ ہے وہ شہادت جو اسلام اور مسلمانوں کے ان دشمنوں کے متعلق ابوالکلام صاحب آزاد کی طرف سے پیش ہوئی ہے۔ آپ ذرا سوچئے کہ قرآن کے ان حقائق اور تاریخ کے ان شواہد کی موجودگی میں اور اس کے بعد خود اس تجربہ کے پیش نظر جو ان کی طرف سے ہمیں ذاتی طور پر ہو چکا ہے، ان پر کسی معاملہ میں دوستانہ بھروسہ کرنا خود فریبی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہو گا کہ ان کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کیا ہو۔ قرآن ہمیں یہ کہتا ہے کہ فریق مخالف کے ساتھ تعلقات معاہدہ کی رُو سے قائم ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرتا کہ جو لوگ اخلاقی اقدار کو کوئی وقعت نہیں دیتے ان کے نزدیک معاہدہ کی بھی کچھ حیثیت نہیں ہوتی۔ سولن کے الفاظ میں، معاہدہ مکڑی کا جالا ہوتا ہے جو اپنے سے طاقتور کے سامنے تار عنکبوت کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اپنے سے کمزور کو بڑی آسانی سے پھانس لیتا ہے۔ اس لئے قرآن اس پر زور دیتا ہے کہ تمہارے اپنے اندر اتنی قوت ہونی چاہیئے کہ فریق مخالف معاہدہ شکنی کی جرأت ہی نہ کر سکے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری سرحدیں اس قدر مضبوط ہونی چاہئیں جن سے دشمن کے دل دہل جائیں۔ لہٰذا ہمیں ہندوستان یا کسی دوسرے ملک سے معاہدہ کرنے سے پہلے اپنے اندر وہ طاقت پیدا کرنی چاہیئے جو استواری عہد کی ضامن بن سکے۔ اس میں شبہ نہیں کہ طاقت کا دوسرا نام فوج ہے لیکن دور حاضر میں شہری آبادی (civil population) کی طاقت کو فوجی طاقت کے مقابلہ میں کچھ کم اہمیت حاصل نہیں۔ فوجی طاقت انڈے کے چھلکا کی ہوتی ہے۔ اگر انڈا کچا ہے تو وہ چھلکا معمولی سی ٹھیس لگنے سے بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ لیکن اگر انڈا ابلا ہوا (لہٰذا ٹھوس ہے) تو اس کا چھلکا بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔ لہٰذا کسی مملکت کی قوت کا مدار اس کی شہری آبادی کی یک رنگی، یک جہتی، عزیمت، ثبات، استقلال اور بلند حوصلگی میں مضمر ہوتا ہے۔ لیکن یہ جوہر اسی قوم میں پیدا ہو سکتے ہیں جنہیں نظم و نسق حکومت پر پورا پورا بھروسہ ہو۔ جو انہیں اپنا ہمدرد اور مشفق سمجھے۔ جہاں سے انہیں عدل و انصاف کی پوری پوری توقع ہو۔ جنہیں وہ اپنے مال اور جان اور عزت و ناموس کا محافظ اور اپنے اہل و عیال کا نگران و پاسبان تصور کریں۔ جنہیں اس کا محکم یقین ہو کہ یہ نظم و نسق ہماری بہبودی، خوشحالی اور ترقی کے لئے قائم ہے۔ جنہیں اس پر ایمان ہو کہ اس نظم و نسق کے قیام سے عدل و احسان کا قیام وابستہ ہے اور اس کے گر جانے سے شرف انسانیت کا قصر بلند گر جائے گا۔ جس قوم کو اپنی مملکت کے نظم و نسق کے متعلق اس قسم کا یقین ہو، وہ قوم اس مملکت کی حفاظت اور اس نظم و نسق کے استحکام کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر تیار ہوتی ہے۔ تیار ہی نہیں بلکہ بیقرار ہوتی ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے باشندوں کو

اپنے نظم و نسق کے متعلق اس قسم کا یقین اور اعتماد ہے تو پھر آپ کو کسی گوشہ اور کسی سمت سے کوئی خوف اور اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ پھر آپ دنیا کی ہر قوم کے ساتھ برابر کے معاہدات کیجئے، انہیں اس کی جرأت ہی نہیں ہو سکے گی کہ وہ ان معاہدات کے ایک حرف کی بھی خلاف ورزی کر سکیں۔ لیکن اگر آپ کو اس کا یقین حاصل نہیں تو پھر آپ کو نہ ہندو سے کسی بھلائی کی توقع رکھنی چاہیئے نہ انگریز سے۔ نہ امریکہ سے کسی امداد کی اُمید کرنی چاہیئے نہ روس سے۔ دوسرے کی نگاہوں میں عزت اسی کی ہوا کرتی ہے جس کی عزت خود اپنوں کی نگاہوں میں ہو۔ لیکن اس عزت کے ماپنے کا پیمانہ نہ تو وہ جلسے ہیں جن میں پچاس پچاس ہزار آدمی تقریریں سننے کے لیے جمع ہوتے ہیں اور نہ ان کے وہ فلک شگاف نعرے جو فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ ہماری قوم شاعروں کی قوم ہے جن کے نزدیک یہ جلسے بزم مشاعرہ اور ان کے نعرے شاعروں کی داد سے زیادہ کچھ معنی نہیں رکھتے۔ نہ ہی اس عزت کا معیار الیکشنوں کی جیت ہے جسے برسرِ اقتدار پارٹی تدبیر کی خفیہ سازشوں کی بنا پر حاصل کر سکتی ہے۔ [اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو شخص اقتدار کی مسند سے الگ ہو جاتا ہے اس کا کسی الیکشن میں جیتنا تو در کنار، اسے کرائے پر مکان تک بمشکل ملتا ہے] اس عزت کا صحیح معیار یہ ہے کہ

کہتی ہے تم کو خلقِ خدا غائبانہ کیا؟

اس قسم کی صحیح عزت حاصل کرنے کا ذریعہ صرف ایک ہے اور وہ ہے ربوبیت عامہ۔ یہ ایسی بنیادی شرط ہے کہ جو باپ اپنے بچوں کی پرورش نہیں کرتا وہ بچوں کی نگاہ میں کسی عزت کا مستحق نہیں ٹھہرتا۔ اس سے بھی آگے بڑھئے۔ خود خدا نے یہ کہہ دیا ہے کہ الحمد للہ رب العلمین کہ اللہ کی حمد و ستائش بھی اسلئے ہے کہ وہ ربوبیت عامہ کا ذمہ دار ہے۔ جب ربوبیت کے بغیر خدا کی بھی حمدیت نہیں تو اور کون ہو سکتا ہے جسے ربوبیت کے بغیر عزت حاصل ہو جائے۔ جو لوگ خالی الفاظ سے درخورِ حمد و ستائش بننا چاہتے ہیں ان کے متعلق خود خدا نے کہہ دیا ہے کہ "یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا" ان بیوقوفوں کی بھلا دیکھئے کہ یہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ یہ کر کے نہیں دکھاتے اس کی وجہ سے ان کی تعریف کی جایا کرے۔

اور اس ربوبیت کا طریقہ صرف یہ ہے کہ مملکت میں قرآن کا تجویز کردہ نظام ربوبیت رائج کیا جائے۔ اس کے سوا نہ مملکت کے استحکام کا کوئی اور طریقہ ہے اور نہ ہی نظم و نسق مملکت کے سزاوار حمد و ستائش ہونے کا کوئی ذریعہ۔ وفیھا بعسا تولغوا ...

یہ ہیں وہ "لمعات" جو ہم نے آج سے بیس سال پہلے لکھے تھے اور جنہیں ہم نے بلا کم و کاست نقل کر دیا ہے۔ جو قرآنی حقائق ان میں پیش کئے گئے ہیں ان کے پیش نظر کیا اس بات کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ بھروسہ اور اعتماد اور یگانگت اور راز داری کے تعلقات استوار کئے جائیں۔ ہم نے اپنے آئین میں اس امر کی صراحت کی ہے کہ مملکت پاکستانیہ کا جملہ کاروبار ان حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے گا جو خدا کی طرف سے متعین کی گئی ہیں۔ غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کی جو حدود خدائے تعالیٰ نے مقرر کی ہیں انہیں ہم نے بصراحت درج کر دیا ہے لہٰذا ہندوؤں کے ساتھ معاملات طے کرنے میں ان حدود کی پابندی اب ہماری مملکت کا آئینی فریضہ بھی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے ارباب بست و کشاد اس سمت میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اس امر کا اطمینان کر لیں گے کہ وہ ان حدود سے ٹکراتا نہیں۔ یہی ہمارے ایمان کا تقاضا اور آئین کا مطالبہ ہے۔

برہمو سماجی اسلام

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ ہمارے سامنے روزنامہ نوائے وقت کا ۸ جولائی ۱۹۷۳ء کا پرچہ سامنے آیا جس میں ہم نے ان سطور کو لکھا دیکھا اس میں مختلف ممالک کے باہمی تعلقات

کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے ؛

(اگر یہ ہو سکتا ہے تو پھر) پاکستان، بنگلہ دیش اور ان دونوں کے بڑے بھائی بھارت آپس میں کیوں مل کر نہیں بیٹھ سکتے ؟ پاکستان، بنگلہ دیش، بھارت اور افغانستان کیوں علاقائی استحصال کے باعث یک جان و دو قالب کی مثال نہیں بن سکتے ؟ پاکستان، بنگلہ دیش، بھارت اور افغانستان کیوں ہمسایہ ملک روس کی شرکت میں مل کر ایشیائی سیکورٹی پیکٹ کے خواب کی تعبیر مہیا نہیں کر سکتے۔ سوشلزم، امپیریلزم، برہمن سامراج پاکستانی اسلام کے میل سے کیوں ایک نئی آئیڈیالوجی ایک نئے درشن، ایک نئی فلسفی، ایک نئے نظریۂ حیات کو معرضِ وجود میں نہیں لایا جا سکتا۔

آپ کو معلوم ہے یہ کون بزرگوار ہیں جو کفر اور اسلام کے امتزاج سے ایک نئی آئیڈیالوجی اور نئے نظریۂ حیات کو وجود میں لانے کی تجویز پیش کر رہے ہیں ؟ یہ ہیں محترم میاں محمد شفیع صاحب جو م۔ش کے قلمی تخلص سے اپنی ڈائری لکھا کرتے ہیں۔ مندرجہ بالا الفاظ ان کی ڈائری سے مقتبس ہیں جو ۸ رجولائی کے نوائے وقت میں شائع ہوئی ہے۔ م۔ش صاحب دعوائے کیا کرتے ہیں کہ انہوں نے قائداعظمؒ کے زیرِ علم تحریکِ پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ انہیں علامہ اقبالؒ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہے اسلام کا نام زبان پہ آتے ہی ان کی پلکیں نم آلود ہو جاتی ہیں۔ ان دعاوی کے بعد وہ روس کی شرکت میں آکر برہمنی سامراج اور پاکستانی اسلام کے امتزاج سے ایک نئی آئیڈیالوجی اور نئے نظریۂ حیات کو وجود میں لانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ وہ خواب تھا جسے (مہاتما) گاندھی دیکھا کرتے تھے لیکن جسے اقبالؒ کے پیش کردہ پاکستان اور قائداعظمؒ کے جہاد نے خوابِ پریشان بنا کر رکھ دیا تھا (مہاتما) گاندھی نے قرارداد پاکستان منظور ہونے کے بعد تلملاتے ہوئے لکھا تھا :

میری روح اس بات کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ حیات کے حامل ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کو تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مرادف ہے۔ کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا ہے۔ (ہندوستان ٹائمز　بحوالہ ۱۲)

اس پر بھی جی نہ بھرا تو لکھا کہ :

میں ایک تنگ نظر ہندو یا تنگ نظر اسلام کا تصور نہیں کر سکتا۔ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے اور ایک بہت بڑی قوم ہے۔ جو مختلف تہذیبوں پر مشتمل ہے لیکن مسلم لیگ نے مسلمانوں کو یہ سبق پڑھانا شروع کر دیا ہے کہ یہ تہذیبیں ایک دوسرے میں جذب نہیں ہو سکتیں۔ (ہندوستان ٹائمز　بحوالہ ۱۵)

جہاں تک مذہب کا تعلق ہے (مہاتما) گاندھی نے اپنی رسوائے عالم واردھا تعلیمی اسکیم کے سلسلہ میں کہا تھا :

یہ سخت خطرناک بات ہے کہ بچوں کو یہ پڑھایا جائے کہ ان کا مذہب باقیوں سے افضل ہے۔ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس لئے سب مذاہب برابر ہیں۔

یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے ہندو کی طرف سے تحریکِ پاکستان کی مخالفت ہوتی تھی اور جسے اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی کوششوں نے ناکام بنا کر رکھ دیا تھا۔ لیکن اب پچیس سال کے بعد اسی اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے نام لیوا، بھارت پاکستان کے ملاپ سے، ہندوؤں کی اپنی خون گشتہ آرزوؤں کے حصول اور شکست خوردہ مقاصد کی کامیابی کے لئے کوشاں ہیں

چنیں دور آسمان کم دیدہ باشد۔

م۔ش صاحب نے مندرجہ بالا سطور کے آخر میں، اقبالؒ کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے۔

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے   دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

م۔ش صاحب کو (علامہ) اقبال کے قبل از ۱۹۰۵ء کے دور کا یہ شعر تو یاد آگیا (جس کا انہوں نے استعمال بھی غلط مفہوم کے لئے کیا ہے) لیکن انہیں اسی اقبالؒ کی زندگی کے آخری لمحات کے یہ اشعار یاد نہ آئے جن میں انہوں نے فرمایا تھا کہ

نگہ دارد برہمن کار خود را   نمی گوید بکس اسرار خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر   بدوش خود برد زنار خود را (ارمغان حجاز)

نہ ہی انہیں ان کی یہ فہمائش یاد آئی کہ

در صد فتنہ را برخود کشادی   دو گامے رفتی و از پا فتادی
برہمن از بتان طاق خود آراست   تو قرآں را سر طاقے نہادی

نہ ہی ان کی یہ تنبیہ پیش نظر رہی کہ

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے   شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

نہ ہی انہیں حضرت علامہ کا وہ بیان یاد رہا ہے جسے انہوں نے مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے جواب میں شائع کیا تھا۔ اور جس کی شاید املا بھی (م۔ش صاحب کے بعض بیانات کے مطابق) انہی کے ہاتھوں رقم ہوئی ہوگی۔ اس بیان میں انہوں نے فرمایا تھا کہ:

اسلام ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت سے کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے کسی آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں۔

اسی کا نام نظریۂ پاکستان یا اسلام کا نظریۂ حیات ہے۔ آپ 'روس' بھارت' پاکستان کے ملاپ سے ایک نیا نظریۂ حیات وجود میں لا دیجئے۔ اس کے بعد نہ پاکستان باقی رہے گا اور نہ ہی (قائداعظمؒ کے الفاظ میں) اس برصغیر میں اسلام کا وجود ...... ہیچ ہے۔

از باغبان شد است کہ صیاد آں نہ کرد۔

بڑا بھائی

م۔ش صاحب بھارت کو بڑا بھائی قرار دیتے ہیں ہم انہیں یاد دلائیں کہ قائداعظمؒ نے مارچ ۱۹۴۰ء کے مشہور خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ گاندھی جی نے کہا کہ آپ میرے بھائی ہیں۔ اس پر میں نے جواب دیا کہ بیشک آپ ایسے ہی ہوں گے لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ کے پاس تین ووٹ ہیں اور مجھ غریب بھائی کے پاس صرف ایک ووٹ"۔ یہی کیفیت، م۔ش صاحب (کنفیڈریشن جیسے تعلقات میں ان "دو بھائیوں کی ہوگی"۔ ویسے بھی یہ عرض کر دیا جائے کہ قرآن کریم نے مومنین کو ایک دوسرے کا بھائی بھائی قرار دیا ہے۔ کسی کافر کو مومن کا بھائی تو ایک طرف وہ انہیں ایک دوسرے کا دوست بھی تسلیم نہیں کرتا۔

خنجر بدست ہندو

آپ پاکستان کے مسلمانوں کو بھارت کے ہندوؤں کے ساتھ ملا کر ایک نیا نظریۂ حیات وجود میں لانے کے خواب دیکھ رہے ہیں اور بھارت کا ہندو خود وہاں کے رہنے والے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کر رہا ہے وہ آپ کو نظر نہیں آتا۔ اُسے ایک ہندو کے الفاظ ہی میں سُنیئے۔

بھارت کے کہنہ مشق صحافی مسٹر اندر ملہوترا نے انکشاف کیا ہے کہ بھارت میں مسلمان اقلیت کے خلاف تعصب اور

ظلم و تشدد کی انتہا کر دی گئی ہے ان پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند ہیں اور دفاع اور قومی سلامتی کے تمام محکموں سے اکثر مسلمانوں کو نکال دیا گیا ہے۔ باقی نکالے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں سے مذہبی، لسانی، ثقافتی، سیاسی، علاقائی غرض ہر بنیاد پر امتیاز برتا جاتا ہے۔ مسٹر اندر ملہوترہ کا ایک مقالہ ٹائمز آف انڈیا میں شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے مزید انکشاف کیا کہ پونا اور دہلی میں حالیہ فرقہ وارانہ فسادات حکومت کی سرپرستی میں کرانے کے لوگوں سے کرائے گئے اور حکومت کے یہ دعوے محض زبانی جمع خرچ ہیں کہ مسلمانوں کے خلاف قتل و غارت گری کرنے والوں کو سزائیں دی جائیں گی۔

مسٹر ملہوترہ پونا کے حالیہ فرقہ وارانہ فسادات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس فساد کے سلسلے میں "باغی پولیس کے متشددانہ مظاہرے اور ریلوے کے ملازمین کے خلاف قانونی ہڑتال کی تو کوئی اہمیت ہی نہیں رہ جاتی لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ وزیرِ داخلہ اور مہاشکر ڈکشٹ اس تمام صورت حال کو ہندو جاتی کے تعصب کی بجائے خوراک کی کمی اور بیروزگاری کا شاخسانہ بنا رہے ہیں۔ گویا مسٹر ڈکشٹ اکثریت کو یہ شہ دے رہے ہیں کہ وہ بھوک اور بیروزگاری کے بہانے مسلم اقلیت کا قتلِ عام جاری رکھ سکے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہانہ بنا کر فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑکا دینا ہندو سیاست کا طرۂ امتیاز بن چکا ہے۔

پونا میں بھی وہی کچھ ہوا جو احمد آباد میں ۱۹۶۹ء میں ہوا تھا۔ بلکہ اس سے زیادہ وحشت اور بربریت کا ثبوت پیش کیا گیا۔ احمد آباد فساد کی تحقیقات کے لئے جگ موہن ریڈی کمیشن کی رپورٹ کا کوئی مفید نتیجہ نہ نکل سکا۔ احمد آباد کی طرح پونا کے حالیہ فساد میں بھی حکومت یہ کہہ کر ہر طرح سے بری الذمہ ہو گئی کہ فرقہ وارانہ کشیدگی کافی عرصے سے بڑھ رہی تھی۔

ہندو کے ساتھ کانفیڈریشن سے مقصود یہ ہے کہ جو رہے سہے مسلمان پاکستان میں باقی ہیں۔ وہ بھی ان کی تلوار کی نذر ہو جائیں، اور ایک نئے نظریہ کے وجود میں آنے سے یہاں اسلام کا وجود بھی ختم ہو جائے۔ اور پھر آپ خوش ہوں کہ

تھے یہ ہی وہ حساب سو یوں پاک ہو گئے۔

لاہور میں سپئیر پارٹس کی مشہور دکان

اسٹینڈرڈ آٹو موبائلز

سپیشلسٹ ڈاجز، بیڈ فورڈ، لی لینڈ۔ بی۔ ایل۔ ایم۔ سی

ڈیلرز۔ موٹر پارٹس۔ ٹرک (ڈیزل) پارٹس

پر تشریف لائیے!

۱۳۵۔ بادامی باغ ٹیلیفون 69012 لاہور